

عفتا

د





PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



ادبِ چپاے



(فارسی افسانوں کا اردو روپ)

میر غفرار علی

شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ

حمد حقوق کتابت بحق ناشر محفوظ ہیں۔

ادب پارے	کتاب کا نام
قمر غفار شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی	ترجمہ
قمر غفار	ناشر
اللہ دیا کالج ۱/۲۵۷، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵	پتہ
محمد صابر علی سیوانی	خوشنویس
۵۰۰	تعداد
نئی دہلی	نشر
	تقسیم کار
۱۶۰ روپے	قیمت (ڈریکس ایڈیشن)
۳۰ روپے	قیمت (طلباء ایڈیشن)

انتساب

والدہ محترمہ شہداء جہاں بیگم

اور

والد محترم عبد الغفار رضا

کی

شفقتوں کے نام

فہرست

صفحہ نمبر

عنوان

۷	قمر غفار	۱-	مقدمہ
۱۵	محمد حجازی	۲-	خودکشی
۲۹	سید محمد علی جمالزادہ	۳-	سیاسی کارکن
۵۸	سعید نفیسی	۴-	اذانِ مغرب
۶۸	سعید نفیسی	۵-	اپنا وطن
۷۸	علی دشتی	۶-	ماں کی موت
۹۳	ڈاکٹر لطف علی صورتگر	۷-	ایک یادگار دن
۱۰۳	شش پر تو	۸-	ادھم موجی
۱۱۵	صادق چوبک	۹-	یکہی
۱۲۰	یوسف اعتصام الملک	۱۰-	کبوتر اور گوا
۱۲۷	جلال آل احمد	۱۱-	یتیم بچہ
۱۳۱	صادق ہدایت	۱۲-	کبریا داؤد
۱۵۲	ڈاکٹر مہدی حمیدی	۱۳-	میری جنت
۱۶۰		۱۴-	حوالہ جات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مقدمہ

انسان کی زندگی میں کہانی کا ہمیشہ ایک کردار رہا ہے۔ چاہے وہ کہانیاں انسانی تصورات و خیالات کی نمائندگی قدیم زمانہ میں تصاویر اور سنگ تراشی کے ذریعہ کرتی ہوں۔ یا لوک گیتوں کی دھنوں میں انسان کا دل برماتی رہی ہوں۔ خواہ لوری کے روپ میں بچے کو نیند کی آغوش میں پہنچا دیتی ہوں یا دادی اماں کی مشفق زبان سے دیو و پریوں کی دنیا میں لے جاتی ہوں یا قصہ سرائی کے قالب میں ڈھل کر رت جگوں کو جنم دیتی ہوں، خواہ انسان کا ذوق قصہ گوئی ان کو الف بلی اور امیر حمزہ جیسی طولانی داستانوں میں ڈھال دیتا ہو، یا ان کی سچی سنوری تصویر آج کی کہانیاں مغربی افکار اور نئی افسانوی تکنیک سے آراستہ شکل میں ہوں۔ شراب ایک ہے رنگ اور ظرف وقت کے ساتھ بدلے ضرور ہیں۔ یوں بھی جو ادب عصری تقاضوں کو پورا نہیں کرتا وہ وقت سے پہلے اپنی افادیت

کھودیتا ہے۔

موجودہ دور کی ہماہمی، مادی ترقیات کی دین مشینی زندگی والی مصروفیات نے جیسے جیسے وقت کو سکھڑا ہے مختصر افسانے اپنی پوری مقبولیت کے ساتھ رواج پا رہے ہیں۔

دنیا کے ہر قدیم ملک کی طرح ایران میں بھی داستان نویسی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ البتہ انیسویں صدی کے ادیب دورِ مشروطیت سے پہلے اور بعد یورپی (مغربی) ادب سے بہت متاثر ہوئے جس کے سبب فارسی نثر نے ایک نیا پیراہن پہنا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قدیم ایرانی ادب کی عظمت کو کسی طرح موضوع بحث بنایا جاسکتا ہے بلکہ ہر زندہ ادب کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ وقت کے اس کھڑورتوں کے مطابق الفاظ و بیان اور افکار و خیال میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ اس ہی وسعہ کلیہ کے مطابق فارسی نثر میں بھی ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ بقول فرخی سیستانی :

فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر

سخن نو آرد کہ نوراً حلاوتیست دیگر

افتلاب مشروطیت (۱۸۹۲/۱۳۲۲) کے آغاز سے لے کر

انیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ بلا کسی تکلف کے ناول، قصہ نویسی،

ڈرامہ نگاری، صحافت اور تراجم کا دور کہا جاسکتا ہے۔ ایسا نہیں

ہے کہ پہلے ایران میں قصہ نویسی کا رواج نہ رہا ہو بلکہ ظہور اسلام کے

بعد سے لے کر انیسویں صدی تک نثر و نظم دونوں میں ایسی داستانوں کی روایت کثرت سے ملتی ہے جن کا تعلق خیالی نہ ہو کر انسان کی روزمرہ زندگی سے ہے۔

اس کڑی کے تسلسل میں پہلا نام کلیلہ و دمنہ کا لیا جاسکتا ہے جو "پنج تنہا" کے نام سے سنسکرت میں لکھی گئی اور پھر پہلوی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ پہلوی سے عربی میں منتقل کی گئی اور عربی سے لے کر اس کو فارسی سانچے میں ڈھال لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خود ایران میں داستانوں پر مشتمل لکھی کتابوں کی اچھی خاصی فہرست ہے۔ مثلاً مرزبان نامہ، قابو سننامہ، چہار مہالہ، طوطی نامہ، سندباد نامہ، بختیار نامہ اور بہارستان جامی وغیرہ۔ دراصل یہ تصانیف حکایات کے پیرایہ میں بالخصوص بادشاہوں اور ان کے خاندان کے افراد کی اخلاقی تربیت کے لئے لکھی گئیں۔ بالعموم عوام بھی ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔

دسویں صدی کا بہترین شاہکار "شاہنامہ فردوسی" بھی ایران کی نیم تاریخی داستانوں کا مرقع ہے۔ اسی طرح خمسہ نظامی کی رومانی ثنویاں جیسے لیلیٰ و مجنوں، خسرو و شیرین اور اسکندر نامہ وغیرہ سب منظوم داستانیں ہیں۔

سعدی شیرازی کی شہرہ آفاق تصنیف "گلستان سعدی" نظم و نثر کے لبادے میں اخلاقی کہانیوں کا بہترین مجموعہ ہے۔

نظم کے پیراہن میں ملبوس عرفانی و صوفیانہ رنگ لیے داستانوں کا اعلیٰ نمونہ شنوی مولانا روم کو تیرہویں صدی کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح حسین واعظ کا شفی کی "انوارِ سہلی" کو پندرہویں صدی کی یادگار قرار دے سکتے ہیں۔

ایران میں انگریزوں اور روسیوں کے تسلط کے سبب فارسی ادبیات میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور یورپی زبانوں کے اثرات خاص طور پر فرانسیسی ادب کے نقوش بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ زبان کو تکلفات سے مترا کر کے روزمرہ سے قریب لایا گیا۔ زبان و بیان کی سہل پسندی کے ساتھ نئے افکار کو نظم و نثر کی لڑی میں پرویا جانے لگا۔ اس "موجِ جدید" کے احیاء میں مشکلات بھی پیش آئیں لیکن تاکجا، لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

خود تآنی جو قاجاری دور کا ایک درباری شاعر تھا (۱۸۰۸-۵۳) ۱۲۲۳ م اس "موجِ جدید" کے بہاؤ سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا اور گلستانِ سعدی کی نہج پر عوامی زندگی سے متعلق قصہ کہانیوں کو کتاب "پریشان" میں منظم کر دیا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ایران کے ادیب جب پرندوں کی مانند یورپی ممالک سے اپنے گھروں کو واپس لوٹے تو سوغات کے طور پر وہاں سے ادبیاتِ تزیین و نمائش کے لئے بہت سی چیزیں لائے۔ اس طرح دورہ نہضتِ مشروطیت سے نئی تکنک والی داستانوں کا ایک

سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں تاریخی، نیم تاریخی، ناول بھی شامل ہیں اور افسانے بھی۔

اگر تسلسل سے ایران میں جدید فارسی افسانہ نگاری کی تاریخ کو دیکھیں تو پہلے محمد حجازی اور علی وحشتی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ پھر جمالزادہ، صادق ہدایت، بزرگ علوی، طالبوف، سعید نفیسی، شمس بہر تو، صورتگر، علی محمد افغانی، مرزا محمد باقر خسروی کرمانشاہی، محمد مسعود، صادق چوبک، جلال آل احمد، ابراہیم خواجہ نوری، حاجی زین العابدین مراغہ ای، صنعتی زادہ اور مہدی حمیدی وغیرہ ایک لمبا سلسلہ ہے۔

”موج جدید“ کے دور کو دو ”دبستانوں“ میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ”دبستان جمالزادہ“ اور ”دبستان صادق ہدایت“۔ اکثر ادباء نے طرزِ نگارش میں جمالزادہ کی پیروی کی ہے اور بعض صادق ہدایت کے نقشِ قدم پر چلتے نظر آتے ہیں۔

در اصل یہ تمام ادباء اس دور کی نمائندگی کرتے ہیں جب ایران ایک انقلاب سے دوچار تھا۔ قاجاری حکومت دم توڑ رہی تھی اور عوام رضا شاہ پہلوی کی قیادت میں پارلیمانی حکومت کے خواہاں تھے۔ ایران کی تاریخ میں اس سیاسی بیداری کو ”دور مشروطہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور ہندوستان میں اس ہی سیاسی تحریک کو ”جنگ آزادی“ کا عنوان دیا جاتا ہے۔ ہند کے انقلاب میں علماء اور وکلاء نے نمایاں حصہ لیا اور ایران میں یہی کام وہاں کے ادیبوں نے

عوام کے ساتھ مل کر انجام دیا۔ بلکہ خود ہندوستان میں بھی ترقی پسند ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد تحریک آزادی سے وابستہ رہی۔

مندرجہ بالا سطور میں ایران کی جدید قصہ نویسی کی داستان کا سرسری اور تشنہ جائزہ لینے کے بعد زیر نظر تراجم کے بارے میں کچھ کہنا بیجا نہ ہوگا۔

ہر ادب اپنے سماج اور اپنی تہذیب کا غماز ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ایک مزاج اور جداگانہ اصطلاحیں ہوتی ہیں، جن سے کبھی کبھی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے، لیکن اگر ان کو دلچسپی کی خاطر بدل دیا جائے تو وہ ترجمہ کی دیانت داری کے خلاف ہے۔ یوں بھی ترجمہ سے ہمارا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب کو اپنی زبان میں منتقل کر کے اپنے ادب کے دامن کو وسیع کریں اور نئی نئی اصطلاحوں، محاوروں نیز فن کی آمیزش سے اس کے حسن کو دوبالا کریں۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں اس کا فیصلہ وقت کے ہاتھ میں ہے۔

داستان ”رجل سیاسی“ جو جمالزادہ کے معروف افسانوی مجموعہ ”یکی بود و یکی نبود“ سے ماخوذ ہے۔ باقی تمام افسانوں کو مہدی حمیدی کی تالیف ”دریای گوہر“ سے لیا ہے۔ افسانوں کی ترتیب میں بھی حمیدی کی پیروی کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ نقش اول نقش آخر ثابت ہوا کرتا ہے۔ اس انتخاب میں بھی زیادہ تر وہ ہی افسانے شامل ہیں جو میرے ایم۔ اے

کے نصاب میں تھے، اور جن کو پروفیسر سید نبی ہادی نے اس شیریں بیانی کے ساتھ سمجھایا کہ ہمیشہ کے لئے دل پر نقش ہو گئے۔

”ادب پارے“ اس کوشش کے وجود میں آنے کے لئے میں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں ڈاکٹر اجمل اجلی، استاد سید نبی ہادی، جناب ظہیر احمد برنی، سید اختر حسین اور مرحوم جناب مرزا ناصر الدین مسعود بیگ کی تہہ دل سے مشکور ہوں جو پر زور انداز سے اس کام کی تکمیل کے لئے مجھے تحریک دلاتے رہے۔ خاص طور پر اجمل اجلی صاحب کی احسان مند ہوں کہ جنہوں نے نہ صرف میرے ادبی شوق کو اپنے مفید مشوروں سے جلا دی بلکہ افسانوں کے تمام تراجم نظر ثانی کے لئے ان کے مرہون منت ہیں۔

میں اپنی کتاب کے زیور طبع سے آراستہ ہونے کے سلسلے میں عالی جناب محمد باقر کریمیا، پچرل کاؤنسلر جمہوری اسلامی ایران دہلی، جناب اکبر ثبوت صاحب، مسؤل مرکز تحقیقی زبان و ادبیات فارسی، خانہ فرنگ ایران دہلی اور جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی، استاد علامہ طباطبائی یونیورسٹی، تہران کی بید شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر مصطفوی ان دنوں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے ہوئے ہیں اور دہلی کی تینوں یونیورسٹیوں: دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فارسی زبان و ادبیات کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ شکریہ کے ساتھ ہی خلوص نیت سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا بھی اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتی ہوں کہ اگر ان حضرات کا لطف و کرم، ادب دوستی اور علم پروری شامل حال نہ ہوتی تو ہنوز دلی دور است کے مصداق میری اس کوشش کو منظر عام تک آنے میں مزید وقت لگتا۔

میں اپنے عزیز ہونہار شاگرد محمد صابر علی سیوانی کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود کسی ناگواری کے بغیر میری اس کوشش کو کتابت سے آراستہ کیا۔

بہر حال میری کاوش جیسی بھی ہے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

سپر دم تو مایہ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

محمد حجازی

مطبع الدولہ محمد حجازی انیسویں صدی کے آخر (۱۲۷۹ھ شمسی) شہر تہران کے متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں زندگی کی تقریباً بہتر بہاریں دیکھنے کے بعد اس دنیا سے رخصت سفر باندھ لیا۔ ایران میں جدید طرز کی مغربی تعلیم کے لئے قائم ادارہ "دارالفنون" میں ابتدائی تعلیم کے مراحل سے گذر کر حجازی اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس چلے گئے۔ وہاں فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ بھی بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ کیا۔

بنیادی طور پر حجازی کا شمار انیسویں صدی کے اولین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے تین ناول "ہما" "پرہیز" اور "زیبا" فارسی ادبیات میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

حجازی کی نثر شعریت میں ڈوبی ہوئی اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ الفاظ کی موزونیت نے ان کی تحریروں میں موسیقی

جیسا روح پرور آہنگ اور آتشاروں جیسا بہاؤ پیدا کر دیا ہے۔
 بے شک حجازی ایران کے وہ ادیب ہیں جنہوں نے مغربی ادبیات
 کا مطالعہ کر کے جدید فارسی نثر کو تازہ اسلوب اور نئی فکر سے
 روشناس کرایا اور اس کو بیجا تکلفات سے آزاد کیا۔ اپنی مخصوص
 انشا پردازی کے سبب ^{۱۹۰۵ء} میں حکومت کی طرف سے انعام بھی
 حاصل کیا۔

حجازی نے مجلہ "ایران امروز" کی مدیریت کے فرائض بھی انجام دیئے۔
 ان کی تقریباً چھ بیس تصانیف میں سے چند درج ذیل ہیں:
 آہنگ، آئینہ، آرزو، اندیشہ، سرشک، ساغر، پروانہ،
 نسیم، ہزار سخن وغیرہ۔

خودکشی

کچھ دن پہلے میرا ایک دوست میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ کسی معلوم نقطہ پر جمی ہوئی نظریں، اوپر کو کھینچی ہوئی ہنسیوں، ستا ہوا چہرہ، دونوں ہونٹوں کے پھڑپھڑاتے ہوئے کناروں سے اس کی بے چینی اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ کرسی پر آکر ٹپک سا گیا۔ اس کے کانپتے ہوئے جسم سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے اپنے اوپر قابو نہیں ہے۔ اس کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ میں نے اس سے کہا جلد بتاؤ ماجرا کیا ہے! اس بوڑھے کج رفتار نیلے آسمان کے نیچے کون سی بلاؤں نے ناگہانی تمہارے سر پر نازل ہوئی اور کس آفت نے تمہیں آن گھیرا جو تمہارا یہ حال بنا۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر پوچھا، میں تم سے معلوم کرنے آیا ہوں کہ تمہارے نزدیک

خودکشی کا کون سا طریقہ سب سے بہتر ہے۔ معاملہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے
میں نے چند لمحہ سوچنے کے بعد کہا، پہلی لازمی بات تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ آخر
خودکشی کا سبب کیا ہے؟ اب کیونکہ تم مجھے علم خودکشی کا ماہر تسلیم کر رہی
لیا ہے تو میں بھی اسباب کو نظر میں رکھتے ہوئے خودکشی کا طریقہ تم کو
بتاؤں گا۔

اس نے ایک لمحہ کے لئے اپنے ہونٹوں کو سکڑا، پھر بڑی اعتنائی کے
ساتھ حقارت بھرے لہجہ میں کہا: میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم ایسے موقع پر بھی
بات کو سنسی میں اڑا دو گے۔ مجھے تو گمان تھا کہ تمہارے نزدیک میری
کوئی حیثیت اور وزن ہے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ تم مجھے ایک نا سمجھ
سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے پھر انسان کس
کو اپنا دوست و غم خوار سمجھے اور کس سے اپنا دردِ دل بیان کرے۔ اور
ہمدرد اور مخلص یا رکھناں سے لائے جو یار کے غم کو اپنا غم سمجھے۔ یہ کہتے
کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنے دوست کی اس کیفیت کو
بھانپ کر میں نے اپنے چہرے پر رنج و غم کے آثار پیدا کر کے کہا:
یقین جانو تمہارا اس دنیا میں اگر کوئی دوست و غم گسار ہے تو وہ
میں ہوں اور تمہاری بردباری اور سنجیدگی کا جو سب سے زیادہ معترف
ہے وہ بھی میں ہی ہوں۔ لیکن میرے دوست تمہارے سوال کا جواب
کوئی آسان بات تو نہیں۔ کیونکہ تم جانو میں نے کبھی خودکشی کا تجربہ
نہیں کیا ہے اس لئے نہیں جانتا کہ کون سا طریقہ خودکشی کا آسان اور
خوب تر ہو سکتا ہے، اور افسوس کہ جو لوگ خودکشی کو چکے ہیں وہ اپنا
تجربہ بیان کرنے کے لئے واپس نہیں آئے۔ بہر حال اتنا ضرور جانتا

ہوں کہ جو موت سے واقع ہو وہ ہی بہتر ہے۔ شاید زندگی کو آسانی اور جلدی سے ختم کرنے کا بہترین طریقہ پستول کی گولی ہے، لیکن اس کے لئے بھی شرط یہ ہے کہ نشانہ درست ہو اور صحیح جگہ پر لگے۔ کیونکہ میں ایک ایسے شخص سے بھی واقف ہوں جس نے اپنی کینٹی پر رکھ کر گولی چلائی جس کے نتیجے میں اس کے دونوں کانوں کے بیچ سوراخ ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے بہرا ہوا سو الگ۔ بلاشبہ بہرا ہونے کے سبب اس کو دنیا کی بیہودہ باتیں سننے سے نجات مل گئی لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس نے دوبارہ خودکشی کی کوشش بھی نہیں کی۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے تجربہ کا خاطر خواہ اثر نظر نہیں آیا۔ دراصل پستول چلاتے وقت انسان کا ہاتھ کانپ جاتا ہے اور گولی نشانہ پر نہیں لگتی۔ لیکن کوئی اگر اپنے اوپر مکمل قابو پالے تو اس کا نشانہ خطا نہیں کرتا۔ میرے پاس پستول ہے اگر تم چاہو تو تمہیں دے دوں۔ میرا دوست بولا اس احسان کے لئے میں تمہارا شکریہ گزار رہوں گا۔ میں اٹھا اور سونے کے کمرے سے پستول لا کر اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کے استعمال کا طریقہ اپنے دوست کو سمجھانے لگا۔ لیکن درحقیقت میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے اس کو مخاطب کر کے کہا دیکھو یہ تو رہا تمہارے سوال کا جواب۔ لیکن اگر تم سچ مچ مجھے اپنا سمجھتے ہو اور تمہارے نزدیک میری دوستی کی کوئی وقعت اور حیثیت ہے تو مجھے بالکل صاف صاف بتاؤ کہ وہ کون سی مصیبت تم پر آن پڑی جس نے تمہیں خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔

اس نے جواب دیا کوئی نئی بات تو نہیں۔ دراصل دنیا سے میرا دل ادب گیا ہے۔ اور روز آنہ کے یکساں گھسے پٹے ایک سے ہی تھکا دینے

والے شب و روز نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ بس اس ہی طرح کے اسباب کے تحت میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس دنیا میں نہ کوئی کشش ہے اور نہ جاذبیت۔ اور جب آخر کار ایک دن اس دنیا سے چلے ہی جانا ہے تو جتنی جلدی اور جس قدر جلد رخصت ہو جاؤں اچھا ہے۔ اور دوسری دنیا میں جا کر دیکھوں کیا وہاں بھی زندگی کا یہی رنگ و ڈھنگ اور ڈھڑا ہے۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو کر سوچ بچار میں ڈوب گیا۔

میں نے اس کو سمجھایا کہ دیکھو دنیا اس ہی کا نام اور زندگی ان ہی مسائل اور محنت و مشقت سے عبارت ہے۔ اب بالکل صاف ایسا بھی نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ دراصل اس نوعیت کے توہمات کو اپنے دل میں جگہ دے کر تم غلطی کر رہے ہو۔ تمہارے یہ احساسات وقتی اور جلدی بدل جانے والے ہیں۔ زود درنجی اور عارضی جذبول کے تحت تم نے اغداں اور میانہ روی کو اپنے ہاتھ سے دے دیا ہے۔ جس کی وجہ سے تصویر کا دوسرا رخ تمہیں نظر نہیں آیا ہے۔

میری اس ناصحانہ گفتگو سے بے چین ہو کر وہ کرسی پر پہلو بدلنے لگا اور بڑی آزرده آواز میں گویا ہوا، تم ہی بتاؤ اس کے علاوہ کسی اور چیز کا نام پریشانی اور تکلیف ہے کہ بہت سے لوگ بغیر کسی معقول وجہ کے میرے ساتھ نہ صرف یہ کہ برابر تاؤ کرنا جائز سمجھتے ہیں بلکہ میری ترقیوں میں بھی حائل ہوتے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی کبھی کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ پھر میرے ساتھ بلا وجہ کی دشمنی آخر کیا معنی رکھتی ہے؟ کیوں ہمیشہ مجھے پریشان کر کے میری زندگی کو میرے لئے دو بھر بنائے ہیں۔

ظاہر ہے۔ انسانی فطرت کے تحت میرے دل میں بھی جواباً ان کے نہیں اس ہی طرح کے انتقامانہ خیالات پیدا ہوتے ہیں جو میرے لئے مزید اذیت کا سبب ہیں۔ بولو، کیا تمہارے نزدیک زندگی کی صعوبتوں کا اس کے علاوہ کوئی اور نام ہے کہ میرے دوست و اجباب میرے ساتھ چند لمحہ خوشی کے گزارنے کے بجائے منہ بنا کر اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیں۔ ٹھیک ہے انسان مزاجی اعتبار سے ہمیشہ دنیا میں اکیلا اور اجنبی ہے۔ کاش کہ سچ مح تنہا ہی ہوتا! دوستوں میں بھی بعض اس قماش کے ہوتے ہیں کہ وہ شہد کی مکھیلوں کی مانند حملہ آور ہوتے ہیں اور زندگی کا رس نچوڑ کر صرف ڈنک کی چھن بدلے میں دے جاتے ہیں۔ تمہارے نزدیک کیا اس کے علاوہ بھی کسی اور چیز کو مصیبت کے نام سے پکارا جاسکتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس دنیا میں راحت و آرام کس چڑیا کا نام ہے۔ اور مسرت و خوشی کون سی شے کو کہتے ہیں۔ کیا یہی زندگی کا مقصد ہے کہ صبح سے شام تک کوہو کے بیل کی مانند چلتے رہیں اور کسی منزل پر نہ پہنچیں۔ اگر مجھے بھی وہ وسائل میسر ہوتے جن کے ذریعہ دنیا کی لذتوں کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ تو میں جانتا کہ دنیا اور اس کی زنجینیاں کیا چیز ہوتی ہیں اور دل کشتی کس کو کہتے ہیں۔ مگر افسوس دنیا کی ساری خوشیاں اور آسائشیں صرف پیسہ کے دم سے ہوتی ہیں اور میرے پاس اس نام کی کوئی چیز نہیں۔ کس کو قصور وار ٹھہراؤں شاید دنیا میں میرے نصیب میں یہی تھا۔

اس کے بعد ہم لوگ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں ہی کی آنکھیں پُر غم تھیں۔ میرا دوست جس وقت چلنے لگا تو

میں نے اس سے کہا میں تمہارے ارادہ میں تو کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا، لیکن ایک بات کہوں کہ موت برحق ہے اور ایک دن ہمارا شمار گزشتگان کی فہرست میں آجائے گا۔ پھر موت تو اپنے بس میں ہے جب چاہے خودکشی کر لیجئے۔ میری مانو، صرف دو روز کے لئے اس خیال کو پس پشت ڈال دو اور صبح معنوں میں دنیا سے انتقام لینے کی ٹھانو۔ اور اگر اس اقدام کے لئے بھی تمہارا دل آمادہ نہیں ہوتا تو دو دن میری خاطر زندہ رہ جاؤ۔ ذرا دیر کو وہ سوچ کے اٹھا سمندر میں ڈوب گیا، اور اس کے بعد بڑی کمزور اور پست آواز میں بولا: ٹھیک ہے تمہاری دلجوئی کے لئے میں یہ تکلیف برداشت کر لوں گا۔ میں نے کہا: تم نے کیوں کہ اپنی زندگی کے دو دن میرے نام وقف کر دیئے ہیں اس لئے اب جو کام بھی میں تمہارے سپرد کروں اور اس کو جس طرح بھی انجام دینے کے لئے کہوں تم اس کو جوں کا توں قبول کر لو۔ میرے دوست نے جواباً کہا: بسرو چشم، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ مگر اس حکم کی غرض و غایت تو معلوم ہو۔

میں نے بولنا شروع کیا۔ افسوس کہ تم نہ ہو گے اور تمہارے دشمن تمہاری عدم موجودگی کا خوشی خوشی جشن منائیں گے۔ پس اس کے بجائے تم چند لمحوں کے لئے ہی سہی ان کے دلوں کو رنج و غم اور دکھ درد سے ہمکنار کر دو۔ اور وہ اس طرح کہ ان سے تجدید ملاقات یوں کر دیکھے کوئی اپنے کسی عزیز دوست سے ایک مدت ناراض رہنے کے بعد بڑی تڑپ اور محبت سے بڑھ کر ملتا ہے۔ ان سے خوشگوار حول

اور اچھے موڈ میں پیار بھری باتیں کرو اور کیونکہ تمہیں تو صرف دو دن
 ہی زندہ رہنا ہے پس اس کی آرزو بھی مت کرو کہ بدلے میں وہ تمہارے
 ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں لیکن اگر کوئی نقد حساب کے لئے آمادہ بھی
 ہو جائے تو معذرت کرتے ہوئے خوش اخلاقی کے ساتھ وہاں سے اٹھ
 کھڑے ہو۔ تمہیں تو نہ اب کسی یار کی ضرورت ہے اور نہ بددگار کی حاجت۔
 یہ زحمت بھی صرف اس لئے ہے تاکہ اس کے بعد تمہارے دشمنوں کا دل
 تمہاری بے وقت موت پر ڈکھے اور کڑھے۔

اس کے بعد اپنے دوست و اجباب کے پاس جاؤ اور ان کے ساتھ
 خندہ پیشانی اور خوش دلی و گرم جوشی سے ملو۔ خوش گئی کرو و مسکراؤ۔
 کیونکہ اب تم کسی کے محتاج نہیں رہے۔ بلکہ تم ہر کسی سے معلوم کرو کہ
 میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری موت پر
 ان کا دل تڑپ تڑپ کر خون کے آنسو بہائے گا۔

ایک دوسری زحمت تمہارے لئے اور ہے۔ اگرچہ وہ ذرا ٹیڑھی
 کھیر ہے لیکن تم اس کو ضرور انجام دو۔ یاد رکھو اپنی زندگی کے محدود
 لمحہ تم نے میرے حوالے کر دیئے ہیں۔ اس لئے تم میرے پابند ہو۔ پس
 میری ہدایت کے مطابق کل صبح طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل
 چھت پر چلے جاؤ۔ ان دنوں بہار کا زمانہ ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کوئی
 نقصان نہیں پہنچائے گی۔ غم و غصہ کو اس وقت اپنے پاس بھی مت
 پھٹکنے دو اور میری یاد سے اپنے دل کو شاد کرتے ہوئے سورج نکلنے
 کے منظر کو دیکھو کہ فضا میں لمحہ بہ لمحہ رقت، گذرنے کے ساتھ کیا تبدیلیاں

رو نما ہوتی ہیں۔ وادی و پہاڑ کے نظاروں سے لطف اٹھاؤ۔ پرندوں کی دل خوش کرنے والی چہچہاہٹ کو کان لگا کر سنو اور مرنے کو۔ میرے خیال میں سپید صبح، نور کی وہ قسم ہے جو عشق کی پہلی کسک سے دل میں پیدا ہوتا ہے جس کو محبت کی صداقت اور گلزار عشق کی فرحت بخش ہوا کہتے ہیں۔ اور وہ پاک و صاف آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو ہے جو کسی بد بخت کی تکلیف پر بے اختیار بہہ نکلتا ہے۔ وہ آہ ہے جو مظلوموں کی بیچارگی پر ہونٹوں سے نکل جاتی ہے۔ اور وہ پاکیزہ و لطیف دل ہے جو پریشان حال لوگوں کی دلداری میں مشغول رہتا ہے۔ وہ تکلیف دہ خجالت آمیز احساس ہے جو کسی اچھے کام کی انجام دہی سے محروم رہ جانے پر دل میں سرا بھارتا ہے۔ اور وہ شرم ہے جو اپنے سے کمتر لوگوں پر نظر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ آزادی ہے کہ جس میں ہم خود کو بھلا دیتے ہیں۔ گم کر دیتے ہیں۔

تم ذرا اس انداز پر سوچ کر اور عمل کر کے تو دیکھو اور پھر تجزیہ کرو آیا تمہارے احساسات بھی میری طرح ہیں؟ طلوع آفتاب کے مشاہدے کے بعد زندگی کے روزمرہ معمولات میں مشغول ہو جاؤ۔ لیکن گزشتہ زندگی کی مانند نہیں بلکہ اس طور پر کہ تمہارے جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کا دل دکھے بلکہ تمہاری کمی ان کو محسوس ہو۔

تم نے صبح میں کیونکہ ناشتہ پر کچھ بھی نہیں کھایا ہے اس لئے دوپہر کے کھانے میں روٹی، پنیر اور اخروٹ کھاؤ۔ یا اپنی کوئی دوسری پسندیدہ غذا جس کو تمہارا دل چاہے۔ لیکن بس شرط یہی ہے کہ اس

کی قیمت دو ریال سے تجاوز نہ کرے۔

اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک اور لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آؤ۔ بدلے کی پرواہ مت کرو کیونکہ دو دن کی زندگی میں کسی بدلے کا خیال ایک بے معنی چیز ہے۔ بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ تمہارے جانے کے بعد ان کا دل درد و غم میں ڈوب جائے۔

فرصت کے اوقات میں وقت گزاری کے لئے مثنوی مولانا روم کا مطالعہ کرو۔ حافظ کے کلام سے لطف لو۔ اور دوسرے دن کو بھی اس ہی معمول کے ساتھ بسر کرو۔ تیسرے روز پھر جو بھی تمہارا دل چاہے وہی راستہ اختیار کرو۔

میرا دوست مسکرا کر کہنے لگا کیا بے وقوفوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں نے جواباً اس کے رخسار کا بوسہ لیتے ہوئے کہا کہ ہاں بیوقوفی ہے، لیکن تم کیونکہ اپنی زندگی کے اڑتالیس گھنٹے میری تحویل میں دے چکے ہو۔ چنانچہ قول و قرار کے مطابق میں جو کہوں تمہیں اس ہی کام کو انجام دینا ہوگا۔ اس سے کوئی فرار تمہارے لئے ممکن نہیں۔ میرے دوست کو اس لب و لہجہ سے اندازہ ہو گیا کہ بیکار کی حجت بازی سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے، اس لئے خاموشی سے سستول اٹھایا، خدا حافظ کہا اور روانہ ہو گیا۔

تیسرے دن میں نے اپنا تعزیتی سیاہ لباس پہنا — اور اس کے گھڑپنچ کیا۔ اطلاع دی وہ میرے استقبال کو باہر آیا۔ اس کے چہرے سے شادمانی اور مسرت پھوٹی پڑتی تھی میں نے کیا اس وقت

سوگواری کے مراسم ادا کرنے آیا تھا۔ وہ سکا کر گویا ہوا، مرنے کو ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ فی الحال تو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق زندگی کے کچھ دن ہنسی خوشی گزار لوں۔ یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے لیٹ گیا۔ اور ہماری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے۔

سید محمد علی جمالزادہ

فارسی ادب کے شائقین کے لئے جمالزادہ کا نام کوئی اجنبی نہیں ہے۔ ان کی اصل شہرت افسانہ نگاری اور نثر نگاری میں ایک نئے موڑ کی وجہ سے ہے۔ وہ نہ صرف صاحبِ انشاء پر دانہ ہیں بلکہ ایران میں افسانہ نگاری کو نئی مغربی کمناک اور تازہ رجحانات سے روشناس کرانے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

سید محمد علی جمالزادہ ولد سید جمال الدین واعظ تہرانی ۱۲۷۵ھ ۱۲۷۴ ش اسفہان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنی زادگاہ میں حاصل کر کے میٹرکولیشن اور اعلیٰ تعلیم کے لئے پیرس سویزرلینڈ میں بیروت گئے۔ ابھی با حیات ہیں اور سویزرلینڈ کو اپنا وطن ثانی بنائے

ہیں۔

وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام افسانوں میں ہماری اپنی زندگی کے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی اس دور کے سیاسی بحران کی ایک روشن جھلک بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ روزمرہ محاورات کو بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اپنی عبارت میں سمو دیتے ہیں۔ بقول محمد علی موحّد ”جمالزادہ طبعاً قصہ پرداز است و چہ قصہ ای شیرین تر و رنگین تر و دلآویز تر از قصہ زندگی لے۔“

جمالزادہ کی پہلی مشہور داستان ”فارسی شکر است“ ۱۹۲۱ء ۳۰۰ اش جرمن سے نکلنے والے روزنامہ ”کاوہ“ برلن سے شائع ہوئی۔ ”یکی بود و یکی نبود“ عنوان سے چھ داستانوں پر مشتمل ان کا مشہور و معروف افسانوی مجموعہ ایران کے داستانی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ جمالزادہ کی کچھ تصانیف کا یہاں نام لیا جا رہا ہے :

قصہ قصہ ہا، صحرائی محشر، شاہکار، سروتہ یک کر باس (دو جلد) راہ آب نامہ، کشکول (دو جلد) غیر از خدا هیچ کس نبود، دارالجمانین، قلشن دیوان، تلخ و شیرین، کھنہ و نو، ہفت کشور، ہزار ہیشہ، اصفہان نامہ و تراجم وغیرہ۔

سیاسی کارکن

یقیناً آپ پوچھیں گے، میں سیاست میں کیسے آ گیا۔ اور میرا شمار شہر کے معزز لوگوں میں کس طرح ہونے لگا۔ جبکہ ابھی کل ہی کی سی بات لگتی ہے۔ چار سال پہلے تک میں ایک ڈھینا تھا اور کسی طرح اپنے بال **چول** کا پیٹ پال رہا تھا۔

میری بیوی ہر رات واپسی پر میری ٹانگ لیتی اور کہتی، جاؤ دھنک دھنک روٹی دھنکوا اور مکرپی کے جالوں کی مانند روٹی کے ریشوں میں لپٹے

گھر واپس آ جاؤ۔ یہی تمہاری اوقات ہے۔ اپنے پڑوسی حاج علی کو دیکھو، ایک سال پہلے تک اس کی کوئی حیثیت نہ تھی مگر دھیرے دھیرے اس نے اپنی حالت سنبھال کر سماج میں ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس کی بیوی بتا رہی تھی بس ابھی تھوڑے ہی دنوں میں پارلیمنٹ کا ممبر بننے والا ہے۔ ماہانہ تو صرف سو روپیہ ہی ملے گا مگر موٹر گاڑی، نوکر چاکر اور عزت و احترام ہزاروں لیکن تم تو زندگی بھر بس روٹی ہی دھنکا کر دو گے۔ کاش تمہارے بیٹے میں بھی کچھ عقل ہوتی!

اتفاق سے میری بیوی کا کہنا بھی کچھ غلط نہ تھا۔ حاج علی پہلے کیا تھا؟ تن کے کپڑوں کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا لیکن زندگی میں جوڑ توڑ کر کے آج وہ بہت کچھ بن بیٹھا ہے۔ اب جمہوریت پسند کی حیثیت سے اس کا نام اخباروں میں آتا ہے بغیر کسی تنگ و دو کے ممبر پارلیمنٹ بھی بن گیا اور اس وقت حکومت کے اعلیٰ حکام کے ساتھ اس کا بیٹھنا اٹھتا ہے۔

پھر سچی بات تو یہ ہے میرا دل بھی اس دھنیا گری سے اب اچاٹ ہو گیا تھا۔ اور دھنکی کے تاروں کی آواز میرے کانوں کو منکر بیکری کی آوازوں سے بھی زیادہ بری لگتی تھی۔ جب بھی اس کی کمان کو ہاتھ لگاتا تو ایک کراہیت کی لہر میرے بدن میں دوڑ جاتی۔

ایک رات میری منہ زور بیوی نے ایسی لعن طعن کی کہ میں نے بھی دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ آہستہ آہستہ اس کام کو چھوڑ کر حاج علی کی

راہ پکڑ لوں گا۔

خدا کی کرنی دیکھئے قسمت نے بھی میرا ساتھ دیا۔ اور وہی حالات و اسباب پیدا ہو گئے جو میں چاہتا تھا۔ بات کیا ہوئی یہ تو مجھے یاد نہیں آتا، لیکن بازار میں شور و غل بپا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے اپنی دکانیں بند کرو اور پارلیمنٹ کی طرف چلو۔ میں بھی دکان پر بیٹھا مکھیاں ہی مار رہا تھا۔ بجلی کی مانند لپک کر دکان بند کی اور سڑک کے مجمع میں شامل ہو کر نعرہ بازی کرنے لگا۔ چیخ پکار مچا کر وہ ہنگامہ برپا کیا کہ خدا کی پناہ۔

ایسے موقعوں پر لوگ کیا کہتے ہیں میں پہلے سن چکا تھا۔ چلا چلا کر وہی سب دہرانے لگا، اے لوگو، اے غیرت مند ایرانیو! آؤ، دیکھو وطن ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ تم کب تک آنکھیں بند رکھتے بیٹھے رہو گے۔ ہم کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے یا مگر شہیدوں میں شامل ہو جائیں۔ یا جینا ہے تو شان سے، غلامی اور ذلت کا جو اکاندھوں سے اتار کر اے خدا تو قوم کو غیرت و حمیت عطا کر۔

لوگ آہستہ آہستہ بغیر کسی جذبے کے مشینی انداز میں اس طرح دکانیں بند کر رہے تھے جیسے رات ہو چلی ہو اور معمول کے مطابق وہ چھٹی کمر کے راستے سے گھر گھر ہستی کا سامان لے کر لوٹ رہے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ایک گہما گہمی نظر آتی تھی۔ دکانوں پر کام کرنے والے لڑکے چائے خانوں کی طرف جاتے ہوئے زور زور سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ انشا اللہ اب بازار کئی دن تک بند رہے گا۔ آرام سے امام داؤد کی

زیارت کو جاسکیں گے۔ زندگی میں ذرا کی ذرا بے فکری آئے گی۔

یہ ہمارے ہی نعرہ بازی کا نتیجہ تھی۔ دھیرے دھیرے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا اور میرا جوش و خروش چولھے پہ رکھے پانی کی طرح ابلا پڑتا تھا۔ وہ وہ جملے بول گیا کہ خود مجھے بعد میں تعجب ہوا کہ یہ میں کیا کہہ گیا۔ مثلاً اگر بادشاہ نے ہماری مدد نہ کی تو ہم اس کا بھی تختہ پلٹ دیں گے۔ اس جملے نے بھیڑ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ دوست اجاب آکر میرے کان میں کھس پس کرنے لگے، شیخ جعفر خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔ تمہاری عقل کو ہوا کیا، کیوں فضولیات تک رہ رہے ہو؟ ایک دھنیے کو ان خرافات سے کیا مطلب؟ عقل کے ناخن لو۔ لیکن ان نصیحتوں کا شیخ جعفر پہ کیا اثر ہوتا۔ وطن پرستی کا بہانہ لے کر خوب دُند کاٹا۔ قلفی والے سے لے کر سبزی فروش کی دکان تک سارا بازار سر پہ اٹھالیا۔ آہستہ آہستہ اندھے، لالے اور بے روزگار لوگوں کا جھمکٹ میرے اطراف میں لگنے لگا۔ اور مجھے لگا میری بھی کوئی شخصیت ہے۔ خود کو ایران کی مشہور تاریخی داستان کا ہیرو کا وہ آہنگ سمجھ کر، مست ہاتھی کی طرح جھومتا میں آگے بڑھا۔ بھیڑ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور اس طرح پارلیمنٹ کے گیٹ تک پہنچتے پہنچتے تعداد ہزار کے قریب ہو گئی۔ دروازہ پر سنتری نے پبلک کو روک دیا۔ لاکھ جتن کئے، ڈرا دھمکا کر اس سے بھاٹک کھلوائیں، لیکن وہ بھی خوب منجھا ہوا تھا۔ زور، زبردستی، خاطر خوشامد کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ اس کے تیوروں سے صاف ظاہر تھا کہ مذاق و مذاق بھی اسے پسند نہیں ہے۔ اس صورت حال کو سمجھ کر

میں نے مجمع کی طرف اپنا رخ کر کے پتیرا بدلا، بھائی! لوگو! قانون کا احترام ضروری ہے۔ لیکن ایک آدمی تو ہماری نمائندگی کے لئے ضرور ہونا چاہئے جو ممبران کو بتائے کہ فلاں آدمی ایک ہزار جمعیت کے ساتھ انصاف طلب کرنے کو آیا ہے۔ اور کہتا ہے آج ہی کا دن ہے جب ہمارے نمائندہ اپنی وفاداری اور کارگزاری کا ثبوت دیں گے اور انتخاب کے وقت ہم سے کئے اپنے وعدوں کو پورا کر دکھائیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو قوم اپنی جان پر کھیل جائے گی۔ اور اس اشتعال کی ذمہ داری میرے سر نہ ہوگی۔

ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک نوجوان سید زادہ ترچھی طرحدار پگڑی سے بالوں کی ایک لٹ چہرے پہ لہرائے جو اپنی وضع قطع سے چیراسی معلوم ہوتا تھا، سینہ پھلا کر سامنے آیا اور بولامیں یہ پیغام پہنچاؤں گا۔ ابھی اس کو گئے چند لمحہ بھی نہ گزرے تھے کہ شیخ جعفر صاحب کو بلائے جانے کی اطلاع ملی۔ میں اتراتا اکرٹتا ہوا چلا، سوچتا جاتا تھا اگر مجھ سے پوچھا گیا، مدعا کیا ہے؟ اور میں کیا چاہتا ہوں تو جواب دوں گا جو مناسب بھی لگے۔ میں نے چاہا راستہ دکھانے والے چیراسی سے پوچھوں، بھائی! میرے! آج جھگڑا فساد کیوں ہوا؟ ہنگامہ کی وجہ کیا تھی۔ دکانیں کس لئے بند کروانی جارہی تھیں؟ لیکن موقع ہی نہیں ملا اور پل بھر میں، میں نے خود کو ممبران پارلیمنٹ کے سامنے کھڑا پایا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ ایسے حواس باختہ ہوئے کہ راستہ میں پیر کا جوتا بھی نکل گیا اور ایک پاؤں ننگا، دوسرے میں جوتا، اس حلیہ کے ساتھ میں وہاں پہنچا۔

ممبر حضرات ڈھیر کے ڈھیر کرسیوں پر یوں بیٹھے تھے جیسے نماز کے لئے بنی صف میں اقامہ کی حالت میں ہوں۔ تسبیح کے دانوں کی مانند ایک دوسرے سے بالکل سٹے ہوئے کبھی کبھی کسی مولانا کی پگڑی چمک جاتی۔ ان کے سامنے اونچی سی جگہ کچھ اہم حضرات اور ان کے نیچے دائیں بائیں دو تین کلرک وغیرہ قلم دوات اور کاغذ سنبھالے منکر نکیر کی طرح بیٹھے تھے تاکہ اچھائی برائی جو کچھ ہو اس سے کاغذ سیاہ کرتے جائیں۔ اب کہاں تک بیان کروں۔ مختصر یہ کہ سفید بالوں والے ایک سوٹیڈ بوٹیڈ پہلی قطار میں بیٹھے آدمی نے مجھے مخاطب کر کے کہا، جناب شیخ جعفر صاحب! ہاؤس بہت جلد وہ اقدامات انجام دینے والا ہے جس سے آپ سب کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ پکی امید ہے کہ اس کے نتائج عوام کی مرضی ہی کے مطابق برآمد ہوں گے۔ آپ تو جنتا کے ہر درجہ عزیز نیتا ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے پبلک کو اطمینان دلا کر پرسکون کر دیجئے کہ ان کے مطالبات بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے پورے ہوں گے۔ اس کے علاوہ دوسروں نے بھی بہت کچھ کہا لیکن میں بس اتنا ہی سمجھ سکا کہ سوٹ بوٹ والا آدمی ان کا لیڈر ہے۔ کچھ جمہوریت پسند ہیں، کچھ آزاد اور باقی مختلف دوسری پارٹیوں سے۔

ہاؤس سے باہر نکل کر میرا دل چاہا پبلک کے سامنے ایک لمبا چوڑا بھاشن دوں اور وہ نئے نئے کلمات جو پہلی بار میرے کانوں میں پڑے تھے ان کو دہرا دوں لیکن میں نے دیکھا مجمع چھٹ چکا تھا۔ جوش سے بھری غیرت مند ایرانی قوم اپنے مطالبات کو خود ہی درست نہ سمجھتے ہوئے اپنے

اپنے کاموں سے لگ گئی تھی۔ وہ اوباش اور بکے لوگ جو مرغی بازار سے میرے پیچھے ہو لئے تھے۔ میدان کے اندر آپس میں گپ بازی کرنے میں مصروف تھے۔ اور وہ بھول گئے تھے کہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ شیخ جعفر زندہ باد کے نعرہ گلے پہاڑ پہاڑ کر لگا رہے تھے۔ میں بھی سرٹسکا کر اپنی راہ چل پڑا، تاکہ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہ تازہ خبر اپنی بیوی کو سناؤں۔ نوجوان سیدزادہ جو جناب شیخ جعفر کے پیغام کو پہنچانے کا دعویٰ کر رہا تھا وہ بھی میدان کے ایک ڈھابے کی بیچ کمر ٹکائے، پگڑی کو ڈھیلا کر کے چائے پینے میں مصروف تھا۔ اور بالکل بھول چکا تھا کہ کچھ ہی لمحوں پہلے اس کی ذات ملت نجیب ایران اور حکومت کے اعلیٰ افسران کے بیچ ایک رابطہ بنی ہوئی تھی۔ یہی سب سوچ بچار کرتا میں گھر کی طرف چلا جا رہا تھا اور دل میں کہتا تھا کیا ہوا اگر آج رات میرے بچے بھوکے ہی سو جائیں گے مگر میں لیٹ کر تو بن گیا۔

میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی میرے کارناموں کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ ابھی دہلیز سے قدم اندر رکھا بھی نہیں تھا کہ حسنی کی ماں پیار سے مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور بولی، خدا سلامت رکھے اب تم بھی بڑے آدمی بن گئے۔ کل تک تمہیں کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا۔ اور آج جب تم بادشاہ اور اس کے وزراء کے خلاف بغاوت کر رہے تھے تو ایک عالم تمہارے ساتھ تھا اور تم بلبل کی مانند ان کے بیچ چھک رہے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ خود وزیراعظم نے تمہاری خوش بیانی سے متاثر ہو کر تمہارا منہ چوم لیا۔

مرجبا، ہزار آفریں، اب تو حاج علی کی بیوی جل کر خاک ہو جائے گی۔ میری بیوی بیچاری سچ مچ مجھے رستم پہلوان سمجھنے لگی۔ میں نے بھی بڑکین کو ہاتھ سے نہیں دیا اور بردباری کے ساتھ کہا آخر عوام کو بھی ایک بڑے رہنما کی ضرورت ہے جو ان کے مطالبات کو پورا کر سکے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے وہ عجیب و غریب کلمات جو ہاؤس کے ممبران سے سنے تھے اور جنہیں پبلک کے سامنے کہنے کی حسرت دل کے اندر رہ گئی تھی وہ سب کے سب بیوی کے سامنے اگل کر اس کو حیران کر دیا۔

اگلے دن راجدھانی کے تمام اخبارات نے اس خبر کو بڑی تفصیل اور جلی سرخیوں کے ساتھ چھاپا۔ اور میرے وطن پرستی کے جذبے کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ کیا۔ خاص طور پر "شعشعانی اخبار" کہ جس کا پہلا جملہ اپنی بیوی کے غلط سلط پڑھنے کے باوجود مجھے آج تک یاد ہے کہ اگرچہ جعفر دھنیا ہے اور کاوہ آہنگر لوہار تھا لیکن یہ دونوں ایک ہی سیپ کے دو موتی اور ایک ہی گلستاں کے دو پھول ہیں۔ دونوں ایرانی قوم کے پیوت اور جنگ آزادی کے ہیرو ہیں۔

بہر حال ایک آدمی آیا اور کہنے لگا میں ایک اخبار کا نمائندہ ہوں اور آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ ایسی ایسی نئی نئی عجیب و غریب باتیں مجھ سے پوچھیں جو نہ صرف میری عقل سے بالاتر تھیں بلکہ ان کا اس وقت تک کوئی وجود بھی نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ، ایک فرنگی بھی میری میری تصویر اخبار کے لئے کھینچنا چاہتا تھا۔ میری بیوی نے اس کو خوب اول

فل سنائیں اور دروازہ بھی اس کے لئے نہیں کھولا۔ اور کہا ہم ایرانیوں کو تم یوں آسانی سے نہیں پھسلا بہلا سکتے۔

قصہ مختصر یہ، اب میرے لیڈر ہونے میں کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ تمام اخباروں کی سرخیوں میں میرا نام آنے لگا۔ اخبار نگار شہد کی مکھیوں کی مانند میرے گھر کے ارد گرد منڈلانے لگے۔ کون سا لقب اور خطاب ایسا تھا جو نہیں دیا گیا۔ مثلاً: قوم کے سچے رہبر، بابائے وطن، وطن پرست، افلاطون زماں اور ارسطو وقت وغیرہ۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ میری نا بوجھ بیوی ان کے پورے معنی نہیں سمجھتی تھی۔ اور خود میری بدھی بھی اپنی بیوی سے کوئی بہت زیادہ نہیں تھی۔

اب کہاں تک آپ کو زحمت دوں قصہ مختصر اس ہی دن دوپہر سے پہلے پہلے حاج علی مجھ سے ملنے کے لئے آیا اور کہنے لگا میں چاہتا ہوں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بالکل صاف صاف تم سے بات کروں۔ میں نے حقہ بھر کر اس کے ہاتھ میں دیا اور کہا آپ کے ارشادات سننے کے لئے میں تیار ہوں۔ حاج علی نے ایک کش لیا اور بھنویں سکڑتے ہوئے کہا، میرے بھائی! لگتا ہے میری بیماری تم کو بھی لگ گئی ہے۔ اور تم بھی حلوائے مانڈے کے شوقین ہو گئے ہو۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ اگرچہ ایک پیشہ والا اپنے ہم پیشہ کی ترقی سے خوش نہیں ہوتا لیکن ایک عقل مند آدمی کو چاہئے وسیع النظری سے کام لے۔ یہ اپنی جگہ بالکل درست کہ تم نے کل ایک ہی دن میں سیاست کا ایک طویل سفر طے کر لیا لیکن پھر بھی تم اس میدان میں نئے ہواور میں

ایک منجھا ہوا اکلڑی ہوں بہتر ہوگا ہم آپس میں سیاسی سمجھوتہ کر لیں اور اس میدان کے خطرناک دورا ہوں پر ایک دوسرے کی پشت پناہی کریں تم نے سنا ہی ہوگا تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی اور خاص طور سے سیاسی کاموں میں جب ایک پارٹی صرف اپنے اوپر بھروسہ کر کے اس راہ کا سفر کرتی ہے تو دیکھتی ہے دوسرے حریف اس سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ تم سمجھتے ہو ہاؤس کے ممبران سے تمہاری آج کی ملاقات اور گفتگو کا کوئی بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اور اب تمہاری پانچوں انگلیاں گھٹی میں اور سر کڑھائی میں ہوگا۔ خیر میرے بھائی! یہ ایک خواب ہے جو کل تک بکھر جائے گا۔ اور تم دیکھو گے وہ، وہ الزام تمہارے سر تھوپے جائیں گے اور ایسے ایسے بہتان تم پر لگائے جائیں گے کہ خود تمہاری بیوی تم سے بدگمان ہو جائے گی۔ یہ سب لن ترانی کرنے کے بعد حاج علی نے حقہ کا ایک لبا کش لیا کہ پانی گڑ گڑا کر نی سے باہر نکل آیا اور اس کے دونوں نٹقوں سے ریل کے انجن کی مانند دھواں تیزی سے نکلنے لگا۔

اب آپ سے کیا چھپاؤں میں حاج علی کی گفتگو کو پوری طرح نہیں سمجھ پایا لیکن اتنا ضرور مان گیا کہ یہ آدمی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے اور اپنے کام میں بڑا جھٹا ہوا ہے۔ پھر اپنی بیوی کے سامنے مجھے یہ کچھ برا بھی نہ لگا کہ اس کو اپنے برابر کا سمجھ لوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس کی باتوں کو مان لیا اور یہ معاہدہ طے ہوا کہ میں گلی کوچوں میں حاج علی کا نام ممبر شب کے لئے مشہور کروں گا۔ اور حاج علی بھی سیاسی کاموں میں کھل کر میری مدد کرے گا۔

اس ہی گفتگو کے دوران حاجی علی نے مجھے بالکل نئی نئی نصیحتیں کیں اور بقول اس کے مجھے سیاست کی پہلی سیڑھی پہ لا کر کھڑا کر دیا۔

حاجی علی نے دیکھا حقہ کی آگ سرد ہو گئی ہے۔ اور اب اس میں دم نہیں رہا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چلتے چلتے پوچھا اب اگلی میٹنگ (جلسہ) کب اور کہاں ہوگی۔ کلمہ "میٹنگ" اس وقت تک میرے کانوں کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میرے کچھ پلے نہ پڑا۔ حاج علی استاد تھا فوراً تار گیا۔ کہنے لگا تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ٹھیک ہی ہے ہر ایک اپنے پیشہ کی زبان سمجھتا ہے اور سیاست کی اپنی ایک الگ زبان ہوتی ہے۔ تم بھی دھیرے دھیرے سمجھنے لگو گے مثلاً یہی "میٹنگ" کا لفظ یعنی ایک جگہ جمع ہو کر مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرنا اور کہنا اگلی ملاقات کب اور کہاں ہوگی اور موضوع بحث کیا ہوگا اس کو سیاسی زبان میں "میٹنگ" کہتے ہیں۔

اس کے بعد ہر "میٹنگ" کے موقع پر حاج علی مجھے سیاست کی زبان کے دو چار محاورہ یاد کرا دیتا تھا جن میں سے آج بھی کچھ مجھے یاد ہیں مثلاً بامسک یعنی ایک ہی پارٹی کے "ہم مسک" یعنی دوست و آشنا "فعال" یعنی سرگرم "بیمزگی" یعنی موقع و محل کی نزاکت کو نہ سمجھنا۔ اس کے علاوہ "زندہ باد" "مردہ باد" وغیرہ وغیرہ۔

حاج علی کے جانے کے بعد میں نے اپنی بیوی پر رعب ڈالتے ہوئے کہا۔ ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں۔ میری بیوی ہٹکا بٹکارہ گئی اور میں اس کو منہ پھاڑے تکتا چھوڑ، بازار کی طرف نکل گیا تاکہ دیکھوں وہاں کیا خبر ہے۔

محلہ والوں، دکانداروں سے سلام علیک اور مزاج پر سی کوتا ہوا بازار پہنچا تو پتہ چلا وہاں میری شہرت اور عظمت کے چرچے ہیں۔ اور اب میں بازار سے اپنے لئے دس پندرہ دن کا سودا ادھار لے سکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں ہنسا کہ واہ شیخ جعفر دھنیئے، تمہاری بھی قسمت خوب چمکی، قوم کے لیڈر بن گئے۔ اپنے وقت کے انقلابی ہیروز زندہ باد۔

راستہ کے بیچ کچھ لوگوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ میری خوشامد در آمد کرتے ہوئے آہستہ آہستہ میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اپنے اوپر ہوئے مظالم کی کہانی بھی سناتے جاتے تھے۔ جیسے میں کوئی حاکم شہر ہوں یا قاضی وقت ہوں یا پھر ان کے محلہ کا سردار ہوں۔ ایک رونا روتا تھا۔ فلاں ظالم افسر نے مجھے گھر سے نکال کر میری املاک پر قبضہ کر لیا ہے۔ کوئی دہائی دے رہا تھا کہ کسی عالم نے زور زبردستی سے میری بیوی کو طلاق دلو کر خود میری خوبصورت بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ الغرض جب تک بازار پہنچوں پہنچوں سو سالہ شکایات کا دفتر میرے سامنے کھل چکا تھا۔ میں بھی ان سے وعدے وعید کرتا اور ان کی اشک شونی کرتا چلا جاتا تھا۔ لوگ خوش ہو کر مجھے دعائیں دے رہے تھے۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کے دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹادے وغیرہ وغیرہ۔ پس معلوم ہوا کہ سیاسی آدمی انوشیروان کی "زنجیر عدل" کی مانند ہے جس کو صبح سے شام تک مظلوم اور ضرورت مند لوگ کھینچا کریں گے۔ اور اس کا گھر سرکاری دربار کی طرح ہو گا جہاں چور اچکے، دھوکے باز، تامل، غنڈے اور تجارت میں

خسارہ اٹھانے والے سب ہی آکر دہائیاں دیں گے اور پناہ لیں گے۔ اس طرح انسان کو عمر خضر بھی مل جائے تو بھی وہ ان تمام مسائل کو حل نہیں کر سکتا۔

آہستہ آہستہ میں بازار کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں اکڑ بھی رہا تھا۔ لیکن بظاہر اپنے چہرے کو میں نے بہت مسکین اور ہشاش بشاش بنالیا تھا۔ اور پبلک کے سلام کا جواب اس محبت اور اپنائیت سے دیتا جا رہا تھا گویا پچاسوں سالوں سے میں ان کو جانتا ہوں اور ان کی مشکلات حل کرتا آیا ہوں۔ لوگ سوالوں کی بھرمار بھی کئے تھے، جناب شیخ آپ کی نئی کارگزاریاں کیا ہیں۔ کیا ہونے والا ہے۔ حکومت کا موڈ کیا ہے؟ اور میں بالکل اس گہیرتا کے ساتھ جواب دے رہا تھا جیسے پارلیمنٹ اور وزارت پرائیوٹ فون کانکشن براہ راست میرے گھر سے جڑا ہوا ہے۔ میرے جواب بڑے مختصر اور گول مول تھے۔ خدا رحم کرے اب ایسا برا حال بھی نہیں۔ امید تو ہے، معاملہ نازک ہے۔ امکان نظر آتے ہیں، کسی وقت بھی ہنگامہ ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حاج علی کے یاد کرائے کلمات کا بھی جا بجا استعمال کرتا جاتا تھا تا کہ ان کو جتاسکوں کہ میں سچ مح ایک سیاست داں ہوں۔

اپنی دکان کے نزدیک پہنچ کر میں ٹھٹھک گیا۔ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اگرچہ محلہ کے دکانداروں کے سلام اور مزاج پر سی سے اس کا پکا یقین تھا کہ وہ مجھے ادھار قرض دے سکتے ہیں۔ مگر ادھار کی روٹی ابھی

حلق سے اترتی بھی نہیں کہ تقاضے والے گھیر لیتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا پہلے روزی روٹی کی فکر کرنا چاہئے۔ سب سے زیادہ مصیبت تو حسنی کے مدرسے کی فیس ادا کرنا تھا جو ہر ماہ بلائے ناگہانی کی مانند نازل ہو کر میرا جینا دو بھر کر دیتی تھی۔ میں نے کئی بار چاہا حسنی کو مدرسہ سے اٹھا لوں اور کسی کام سیکھنے پر لگا دوں۔ مگر فوراً ہی ہیڈ ماسٹر صاحب آکر دروازہ کھٹکھٹا دیتے اور اتنی زیادہ قرآنی آیات اور احادیث کا ورد کرتے کہ مجھے ماننا پڑتا کہ حسنی کا مدرسہ جانا بہت ضروری ہے اور جیسے بھی ممکن ہو ہر ماہ مدرسہ کی پانچ روپیہ فیس ادا کروں ورنہ تو میں ابن بلعم، و سنان بن انس اور شمر سے بھی زیادہ قابل نفرت و ملامت، خائن، احمق اور کافر قرار پاؤں گا۔

ضمیر اکسار ہا تھا کہ دکان کھولوں اور اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاؤں۔ محنت مزدوری کر کے اپنی روزی حاصل کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ خود ہمارے پیغمبر بھی باغبانی کا کام کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میری بیوی کی غضبناک صورت اور خنجر کی مانند کٹیلی آواز نے یاد آ کر میرے ارادوں کو پسا کر دیا۔

اس ہی سچ کسی کی سلام علیک کی آواز نے میری سوچ کے سلسلوں کو توڑ دیا۔ نظر اٹھائی تو ایک آدمی کو اپنے سر پر یا انکسار اور فدوی بنا، کھڑا پایا۔ جیسے عاجزی و خوشامد کا مجسمہ ہو۔ زبان کہتی معلوم دیتی، میں آپ ہی کا پروردہ ہوں۔ آنکھوں سے غلامی ٹپک رہی تھی۔ جھکی مگر دن ظاہر کرتی تھیں آپ کے گھر کا نمک خوار ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اس کے جسم کا ایک ایک رواں

سراپا زبان دکھائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک میری چاچو سی کرتا رہا۔ پہلے سادگی کے ساتھ درازی عمر کی دعا دی۔ پھر اپنے آپ کو میرے گھر کا نوکر بتایا یہاں تک کہ خود کو میرے در کا کتا بنا دیا۔ اور سو سال سے بڑھا کر میری زندگی ہزاروں برس کی کر دی۔ اس روانی کے ساتھ بول رہا تھا جیسے کوئی رٹا ہوا سبق دہراتا ہو۔ ایک مدت تک اس نے مجھے کچھ بولنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر کبھی آگے کی طرف جاتا کبھی پیچھے ہٹتا، کبھی سینہ پر ہاتھ باندھ کر میری اولاد، میری اولاد کی اولاد، پیڑھی در پیڑھی، دعاؤں کے پلندے اس نے باندھ دیئے۔ اس سے پہلے کہ میری قوت برداشت بالکل جواب دے جائے اور میں کوئی سخت بات کہہ جاؤں، میں نے گھر کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔ وہ بھی میرا قصیدہ پڑھتا، دم ہلاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے گری ہوئی گھٹیا باتیں کرتا جاتا تھا۔

گھر پہنچا اور دروازہ کھلوا کر اندر داخل ہوا۔ سکون کی سانس لی اور سمجھا اب اس واہیات آدمی سے نجات ملی۔ مگر نہیں، وہ بھی میرے ساتھ ہی اندر گھس آیا تھا۔ دروازہ اچھی طرح بند کرتے ہوئے بولا، الحمد للہ اب میں اطمینان سے دو گھڑی چند باتیں آپ سے کر سکوں گا۔ میں حیران و سرگرداں اس کو تک رہا تھا کہ دیکھیں اب پردہ غیب سے کیا باہر آتا ہے۔ اس آدمی نے بغیر کسی تہید کے بادشاہ وقت کو جما جما کر دعائیں دینا شروع کر دیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا شاید بیچارہ دیوانہ ہے یا سدا کا خوشامدی، خیر۔ جب تک موضوع میری ذات تھی میں سنا کیا، لیکن بادشاہ سے مجھے کیا

لینا دینا اس کا گھر ہزاروں سال آباد رہے یا برباد، میری صحت پہ کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پیترا بدلا جیسے میرے دل کی بات سمجھ گیا ہو۔ موضوع گفتگو ایک دم بدل دیا اور وزیراعظم کی جان کو روکنے لگا۔ اور اس دفعہ تعریفی اور دعائیہ کلمات کے بجائے اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔ لگتا تھا خوش بیانی اور بدکلامی دونوں میں ہم دھنیوں سے بھی دس ہاتھ آگے ہے۔ بیچارے فغفور الدولہ کو خیانت کا، بے غیرت، بے عزت اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ اس کے خاندان کو یوں بھانا گویا فغفور الدولہ کی پوری سوانح حیات تفصیل سے پڑھی ہو اور اس کے خاندان سے تب سے واقف ہو جب سے دنیا میں ان کا ظہور ہوا۔ کیا کیا داستان نہ سنائی۔ آخر میں بھرپور اٹھا اور بولا میرے بھائی کیا تم نے شیطان کا بھیجا کھا رکھا ہے کہ تمہاری زبان تالو سے لگتی ہی نہیں کب تک یوں مغز ماری کرتے رہو گے۔ دو گھنٹہ سے تم میرا دماغ چاٹ رہے ہو لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو کس سے شکایت ہے، میں تمہارا کیا مسئلہ حل کر سکتا ہوں؟ جو بھی مقصد ہو وہ کھل کر بیان کرو۔ اور خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دو۔

اس آدمی نے جب دیکھا کہ فضا مکدر ہو چلی ہے اور میرے اعصاب بھی جواب دینے لگے ہیں تو اس نے بناوٹی مسکان کے ساتھ کہا، توبہ توبہ میں آپ کی طبیعت میں کسی طرح کی بد مزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ قسم خدا کی آپ سے صرف اپنا اثر اور محبت کی وجہ سے چلا آیا ہوں۔ اور نہیں جانتا کس طرح اپنا مدعا آپ کے سامنے بیان کروں۔ البتہ اس کا یقین ہے آپ بادشاہ

سلامت کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں کریں گے۔ ہمیشہ آپ کا ذکر خیر کیا کرتے ہیں۔ میں نے بھی آپ کے تیئیں اپنی وفاداریوں کا حق ادا کر دیا ہے اور آپ کی تعریف و توصیف میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں برتی۔ آپ کی طرف سے انھیں یہ بھی جتا دیا ہے کہ جب آپ وزیراعظم بن جائیں گے تو اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دیں گے۔ مزید یہ بھی ان کے گوش گزار کیا کہ جناب شیخ جعفر ہر محفل اور ہر مجلس میں آپ کی مدح سرائی کیا کرتے ہیں۔ اور ان کی بڑی آرزو ہے کہ بادشاہ کی قیادت اور تعاون سے جتنی جلد ممکن ہو سکے ملک کے دشمن، وطن فروش، بدطینت اور شر پسند فغفور الدولہ کو اس کی کمرسی سے اتار کر معصوم جنتا کو اس کے عذاب سے بچائیں۔

دیکھئے شیخ جعفر صاحب شہنشاہ عالم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو وقت نکل جانے کے بعد اپنے بھی خواہوں اور دوستوں کو بھول جاتے ہیں۔ اور اپنے چاہنے والے نمک حلالوں کے ساتھ فغفور الدولہ کی مانند ہماری جوتی ہمارا ہی سر کے محاورہ پر عمل کرتے ہیں۔ اب میں آپ کو کیا بتاؤں کیسی جان توڑ محنت کر کے اور ہزار جتن کر کے میں نے فغفور الدولہ کو وزیراعظم بنوایا اور مطلب نکل جانے کے بعد اس نے طوطے کی طرح مجھ سے آنکھیں پھیر لیں اور یوں ہو گیا جیسے مجھے پہچانتا ہی نہیں۔ لیکن بادشاہ سلامت انسان کے خلوص کی قدر و قیمت کو پہچانتے ہیں۔ الیکشن کے مصارف کے لئے انھوں نے عجلت میں معمولی سی رقم بھیجی ہے۔ رفتہ رفتہ باقی پیسہ بھی آپ کے پاس پہنچ جائے گا پس اب خدا حافظ۔

روپوں سے بھری ایک تھیلی میرے ہاتھ میں تھی اور میں حیران و پریشان
 اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔ جب تک حواس ٹھکانے آئیں وہ آدمی دروازہ کھول
 یہ جا وہ جا۔ شروع میں پوری بات سمجھ میں نہیں آئی کہ معاملہ کیا ہے۔
 روپوں سے بھری تھیلی، لفافہ، مکاری، چکنی چٹری باتیں، آخر یہ سب کس لئے؟
 لیکن دھیرے دھیرے اس کی باتیں یاد آ کر میری سمجھ میں آنے لگا اصل مطلب
 کیا ہے۔ بادشاہ، وزیر اعظم فغفور الدولہ کے معاملات میں ٹانگ اڑا رہا ہے
 اور کیوں کر میرا نام سن چکا ہے اس لئے مجھے اس کے خلاف استعمال کرنا
 چاہتا ہے۔

بہت خوب، میری بھی ایک شخصیت اور مقام ہے یہ سوچ کر میں ہنسنے لگا۔
 اس ہی بیچ روپوں کی تھیلی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی اور
 اس کے اندر سے سکے نکل کر فرش پر یوں ادھر ادھر لڑھکنے لگے جیسے مرغی
 کے بچے کتے سے ڈر کر جان بچانے کو جدھر سینگ سمائیں، بھاگ نکلیں۔ اتنے
 میں اچانک دروازہ کھلا اور یا اللہ کہتے ہوئے حاج علی نے اپنا چہرہ چمکایا۔
 جیسے ہی اس کی نظر موٹی رقم پر پڑی اس کی رال ٹپکنے لگی۔ اپنا تھوڑا آگے
 کی طرف بڑھا کر بولا عجیب، اب محلہ والوں کے رضائی گدوں کی روٹی کے
 ریشوں کے بجائے بادشاہ کے خزانے کی تمہارے گھر میں بارش ہونے لگی۔
 ہاں بھئی! دھنکی کی آواز سے زیادہ پیسہ کی کھفک سب کو اچھی لگتی ہے۔
 معلوم ہوتا ہے دکان دکان بھی بیچ باج دھندے سے بالکل ہاتھ اٹھا
 لیا ہے۔

میں نے پہلے چاہا اس سے جھوٹ موٹ کوئی بہانہ بنادوں۔ لیکن پھر خیال آیا ہم آپس میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ عہد شکنی اصول کے خلاف ہے۔ اور سچی بات تو یہ کہ اپنی موجودہ حیثیت اور اہمیت کو بیان کرنے کے لئے میرا دل چل گیا۔ خوب بڑھا چڑھا کر پورے واقعہ کو الف سے لے کر زے تک بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے بیان کر دیا۔ اور کہا اب جو کچھ بھی تم کہو میں وہی کروں گا۔

حاج علی نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا، ماشاء اللہ ماشاء اللہ، تمہارا کام بھی اب چل نکلا۔ سیاست کی پہلی منزل کو بادشاہ کی مدد سے طے کرنا چاہتے ہو۔ تمہاری مرضی، عاقل و بالغ ہو جو مناسب سمجھو وہ کرو۔ میرا کام تو بھائی چارے کے ناطے سمجھانا ہی ہے۔

مجھے گمان ہوا حاج علی کی نظر پیسہ پر ہے۔ اور اس طرح کی باتیں بنا کر وہ کچھ رستم مجھ سے اینٹھنا چاہتا ہے۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ حاج علی کا مقصد کچھ اور تھا۔ بولا شیخ جعفر اس بات کو یاد رکھو کوئی کام بھی پیسہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ بھٹے بیچنے والا اندھا رحیم ہو یا امین الضرب حاج حسین۔ جو بھی کوئی دو پیسہ کمانے کے لئے دھندہ کرتا ہے پہلے اس میں کچھ سرمایہ لگاتا ہے۔ سیاست بھی یونہی نہیں چل جاتی۔

حاج علی کی بات کاٹتے ہوئے میں نے کہا، تمہارے کہنے کا مطلب یہ پڑھنا لکھنا ضروری ہے۔ وہ زیر لب مسکرا کر بولا، پڑھائی لکھائی سے سیاست کا کیا تعلق؟ لیڈر مدرسہ تو کھول کر نہیں بیٹھتا۔ میں نے کہا پھر یقیناً تم کہنا چاہتے

ہو کہ کسی نہ کسی کام میں مہارت کا ہونا ضروری ہے۔ بولا، ارے بابا خدا تمہارے
 حال پر رحم کرے۔ کسی کام میں ماہر ہونے سے سیاسی آدمی کا کیا سمجھ؟
 پھر کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مکہ، کربلا اور شہد کی زیارت کر چکا ہو؟ نہیں
 بھئی! سیاست اور مذہبی ارکان کا آپس میں کیا تال میل۔ سیاسی آدمی
 کو تو بس چست و چالاک ————— ہونا چاہئے اور موقعہ پرست تعلیم و
 تربیت، زہد و تقویٰ یہ سب کیا؟ سیاسی آدمی کی دکان کا سرمایہ
 تو اس کا شریف ہونا ہی ہے۔ میں نے پوچھا یعنی دوسرے کی بیوی پر
 بری نگاہ نہ ڈالے۔ یتیم بچہ کے مال میں خیانت نہ کرے۔ ارے بھئی نہیں،
 تم بھی کمال کرتے ہو۔ شرافت کا ان سب باتوں سے کیا تعلق؟ شریف
 ہونے سے مراد یہ کہ سیاسی آدمی رشوت نہ لے۔ میں نے سوال کیا،
 رشوت سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ وہی جو ہمارے دیش کے ملا مولوی
 اور دھرماتما لیتے ہیں؟ کہنے لگا، ہاں! بالکل ٹھیک تم سمجھے۔ پہلے زمانہ یاں
 چھوٹے آدمی بڑے بڑے افسران، عہدے داران اور ملاؤں کو رشوت
 دیتے تھے۔ لیکن جب سے آئینی حکومت کا دور دورہ ہوا ہے معاملہ
 اس کے برعکس ہے۔ اب بڑے بڑے حکام، افسران، وزراء اپنے
 ماتحتوں کو رشوت دیتے ہیں۔ میں نے کہا بھئی اس کو رشوت نہیں
 کہتے۔ یہ تو صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔ اس میں برائی بھی کیا ہے۔ حاج علی
 بولا، دیکھو صدقہ تو خدا کی راہ میں دیتے ہیں۔ لیکن رشوت کے پس پردہ
 کوئی مطلب چھپا ہوتا ہے۔ پہلے زمانہ میں لوگ جب کسی بڑے عہدے

پر پہنچنا چاہتے تھے تو بادشاہ اور اس کے وزیر کو ہزاروں کی رشوت
 نذرانے کے نام سے دیتے تھے تب اپنی مراد کو پہنچتے تھے۔ آج اس مقصد کو
 حاصل کرنے کے لئے بڑا آدمی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں بڑے بڑے
 نوٹ بھر کر سیاسی کارکنوں کے گھر کے چکر کاٹتا ہے۔ تو وہ اپنے
 سیاسی منصب کو حاصل کرتا ہے۔ اور ان حضرات کا دن رات یہی
 کاروبار ہے۔

مگر تم تو کہتے تھے کہ قوم کے سیوک کو رشوت نہیں لینی چاہئے۔
 بھی تم سمجھتے کیوں نہیں؟ شروع میں رشوت نہ لینا ہی کامیابی کا راز
 ہے لیکن جب سیاست کے میدان میں قدم جم جائیں تو خوب
 نقارہ کی چوٹ پر نہ صرف یہ کہ رشوت لے سکتے ہو بلکہ رشوت خوروں
 کے گروہ کی قیادت کر سکتے ہو لیکن شرط یہ ہے کسی کو کانوں کان
 خبر نہ ہو۔ حتیٰ تمہاری بیوی اور بچے بھی نہ جان سکیں تب تم منجھے ہوئے
 لیڈر سمجھے جاؤ گے۔ لیکن اتنی زیادہ چالاکی اور ہوشیاری ہر ایک
 کے بس کا کھیل نہیں۔ سوائے ان حضرات کے جو پہلے داروغہ اور
 کوتوال رہ چکے ہوں۔ مذہبی پیشوائی کر چکے ہوں یا واعظ و مجلس پڑھنے
 کے فرائض انجام دے چکے ہوں۔

اب بات کو کہاں تک پھیلاؤں۔ قصہ مختصر حاج علی کی باتیں میں
 نے خوب غور سے سنیں۔ اور اچھی طرح عقل میں یہ بات آگئی کہ روپوں
 کی تھیلی لے کر میں نے کیا حماقت کی ہے۔ ابھی سارے شہر کو معلوم

ہوا جاتا ہے کہ شیخ جعفر کسی مقام پر پہنچے بھی نہیں اور رشوت لینا شروع کر دی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا شیخ جعفر تمہارے لئے یہ مناسب نہیں۔ کچھ ہی دیر میں دوست دشمن سب جمع ہو کر تمہاری دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں گے۔ اور کہیں گے ”این زمان پنج پنجہ کی گید“ کوئی نہ کوئی ترکیب کرنی چاہئے ورنہ محنت سے حاصل کی یہ ساری عزت و آبرو خاک میں مل جائے گی۔

میں نے گھر سے نکل کر پارلیمنٹ کی راہ لی۔ دیکھا لوگوں کا جم غفیر ایک ہنگامہ مچائے ہے۔ پوری طرح تو میں معاملہ کو سمجھا نہیں البتہ کچھ الفاظ کانوں میں پڑے، جیسے خیانت، سولی، قید، وطن فروشی وغیرہ۔ بہر حال میں اس نتیجہ پر تو پہنچ ہی گیا کہ نمائندگان قوم نے پھر کسی کے پھٹے میں اپنی ٹانگ اڑائی ہے اور ان کے اس رویہ نے پبلک کو برا فروختہ کر دیا ہے۔

اس ہجوم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اپنے گھیرے میں مجھے لے لیا۔ سلام و دعا اور مزاج پرسی کے بیچ ایک آواز میرے کانوں میں آئی۔ جناب شیخ جعفر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں جب تک معاملہ کی نزاکت کو سمجھوں کچھ لوگوں نے اپنی گودی میں بھر مجھے ایک اونچے سے مقام پر بٹھا دیا جتنا منہ پھاڑے آنکھیں ٹکٹکائے گوش بر آواز تھی کہ جناب شیخ کیا فرماتے ہیں اور مجرموں کو کیونکر ان کے حوالے کرتے ہیں۔ میں نے بھی اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے بڑی مشکل سے وہ چند کلمات جو حاج علی نے مجھے

سکھائے تھے۔ زوردار لب و لہجہ میں دہرا دیئے۔ وطن فروشوں کی ہم اچھی طرح خبر لیں گے۔ وہ سمجھتے کیا ہیں۔ بھائی لوگو! آج ہی کا ایک دلچسپ واقعہ میں آپ کو سناؤں۔ مجھے رشوت دینے کی کوشش کی گئی۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں مجھے خرید لیں گے۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ ایسے ایسے روپیہ پیسہ کالا لچ دینے والے ہم نے بہت دیکھے ہیں۔ ہزاروں کیا وہ کروڑوں کا ڈھیر بھی میرے سامنے لگا دیں تو بھی وہ مجھے وطن پرستی کی راہ سے نہیں بھٹکا سکتے۔

اس وقت میرا دل بہت چاہا کہ مقرر حضرات کی مانند اپنا سکہ جمانے کو فرنگیوں کی وطن دوستی کی کوئی مناسب داستان پر اثر انداز میں بیان کر دوں۔ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ دراصل میں ابھی دوسروں کی طرح اس فن میں طاق نہیں ہوا تھا۔ لہذا اس ارادہ کو ترک کر دیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر روپوں کی تھیلی کو نکالا۔ جتنا کو دکھاتے ہوئے موقع کی مناسبت سے جو شعر یاد آ رہا تھا اسیٹھے سرود میں پڑھا۔ اور جب لوگ خوب تالیاں بجا چکے تو میں نے مجمع کے درمیان اپنی دکان پر کام کرنے والے ہاشمی نام کے لڑکے کو آواز دے کر بلایا جو بڑے زور شور سے تالیاں بجا رہا تھا۔ روپوں کی تھیلی اس کو دے کر کہا، لو اس کے مالک کو پہنچا دو اور اس سے کہو چند سکوں کے عوض ایک وطن پرست کو خریدا نہیں جاسکتا۔ ہاشمی ہٹکا بٹکا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس نے تھیلی پکڑی بھی نہیں کہ بھیڑ نے شیخ جعفر زندہ باد کے نعرہ لگاتے ہوئے

مجھے اپنے گھیرے میں اس اندھے کی مانند لے لیا جس کو حضرت عباس کی دعا سے دوبارہ بینائی ملی ہو۔ اس ہنگامہ سے جب ذرا ہوش میں آیا تو دیکھا پارلیمنٹ کی عمارت سے کافی فاصلہ پر اکیلا کھڑا رہ گیا ہوں۔ میں نے چاہا پائپ کا ایک کش لگاؤں لیکن پتہ چلا کہ زندہ باد کے نعروں کے بیچ جو ابھی بھی میرے کانوں میں گونج رہے تھے کسی نے میری جیب سے تبرک کے طور پر پائپ، تمباکو کی ڈبیہ اور جھوٹی موٹی طحییزیں سب صاف کر لی تھیں۔ میرا دل تو زیادہ ان سکوں کی وجہ سے دکھا جو میں نے بادشاہ کی تھیلی سے نکال کر دال روٹی کے انتظام کے لئے اپنی جیب میں ڈال لیے تھے۔

اس ہی شش و پنج میں تھا کہ ایک شناسا آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں گھبرا سا گیا۔ نگاہ اٹھائی تو وہی آدمی سامنے کھڑا تھا جو بادشاہ کی طرف سے روپوں کی تھیلی دے گیا تھا۔ میرا دل چاہا اسے سڑی سڑی گالیاں دے کر اپنی وطن دوستی کا پرچار کروں لیکن جمع چھٹ چکا تھا اور اس جوش و جذبے کے دکھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس آدمی نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اور پہلے کی طرح خوشامد درامد کرنے لگا۔ چالوسی کے چند کلمات کے بعد ابھی اس نے سانس بھی نہیں لیا تھا کہ بادشاہ کا سلام و پیام مجھے پہنچانے لگا۔ بتایا آپ کی تقریر کے دوران میں یہیں پر تھا۔ بہر حال اپنا برا بھلا آپ خود اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ آپ نے جو مناسب سمجھا وہی کیا۔ صاحب، تقریر کے فن میں مان گئے آپ کو اپنے

عہد کے افلاطون ہیں۔ یقیناً لوگ آپ کا سنہری مجسمہ بنا کر نصب کریں گے۔ تمام فرنگستان کے بچہ بچہ کی زبان پر آپ کا نام ہے جب کل آپ وزیر برضے جائیں گے اور آپ کے طفیل ہم جیسوں کو بھی کوئی عہدہ مل جائے گا تو ایک عالم دعا دے گا۔

الغرض وہ گھڑ تک اسی طرح کی باتیں کرتا اور مجھے مکھن لگاتا چلا آیا۔ میری عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اس بادشاہ کے چچہ کے شر سے کس طرح خود کو رہائی دلاؤں۔ تیزی سے گھریں داخل ہو کر پوری طاقت سے دروازہ بند کر لیا۔ پھر سکون کا ایک گہرا سانس لے کر وضو کرنے بیٹھ گیا۔ اتنے میں بیوی اور ہاشمی ملازم کے واے ویلا بچانے کی آواز کانوں میں پڑی۔ میری بیوی چیخ کر کہہ رہی تھی، شیخ جعفر آؤ اور دیکھو تمہارے نوکر نے کیا دھاندلی مچائی ہے۔ اس بے غیرت نے تمہاری بھجوانی تھیلی سے پندرہ روپیہ نکال لیا ہے اور کہتا ہے یہ میری ایک ماہ کی تنخواہ ہے۔ بھلا کوئی بلی کو بھی گوشت کا نگہبان بناتا ہے۔ تم بھی بڑے مورکھ ہو۔ کیا تم اس بے شرم کو نہیں پہچانتے ہو؟ کیا تم اس کے ساتھ نہیں آ سکتے تھے؟ بہر حال یہ عقدہ کھلا کہ ہاشمی کو جلسہ میں جو تھیلی جمع کے سامنے میں نے واپس کرنے کو دی تھی۔ وہ میری بات کیونکہ سمجھ نہیں پایا تھا اس لئے اس کو گھڑ لے آیا اور اپنا حساب خود ہی صاف کر لیا۔ خیر۔ خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اس میں کوئی بہتری ہوگی میں نے بھی اس کی رضا کے آگے سر جھکا دیا لیکن بظاہر دکھانے کو ہاشمی کو کچھ بُرا بھلا بھی کہا اور

ہاشمی نے بھی اپنا بڑا کپن دکھاتے ہوئے کچھ برا نہیں مانا اور چپ چاپ روپیہ جیب میں ڈال لیا۔

اگلے دن سب میرے نام کی مالا جپ رہے تھے۔ بازاروں میں لوگ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ شیخ جعفر نے سونے کی چمکتی اشرفیوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور جوں کی توں اس کو واپس کر دیا۔ لوگوں نے یہاں تک کہا کہ شاہ نے شیخ جعفر کو لالچ دیا کہ اگر اس کے راستہ سے ہٹ جائے تو وہ اسے ہزاروں انعام و اکرام اور خطابات سے نوازے گا۔

بہر حال آہستہ آہستہ شہر کے مشہور ترین لوگوں میں میرا شمار ہونے لگا۔ حاج علی بھی دو تین بار آئے اور شکوہ کیا کہ مجھے آپ نے بالکل ہی بھلا دیا۔ لیکن میں نے اس کو منہ نہیں لگایا۔ وہ بھی اپنی راہ لگا۔ بعد میں کسی نے میں نے سنا اس نے اپنا کوئی کاروبار شروع کر دیا ہے اور وہ خوب چل نکلا ہے۔ پیسہ کیا ہاتھ لگا سب سیاست و ست بھول گیا۔

چند ماہ بعد جب الیکشن ہوئے تو میں جمہوریت پسند اور آزاد پارٹی دونوں کی طرف سے منتخب کر لیا گیا۔ لیکن کچھ ہی چہینے مہری کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کام بڑا جو کھم کا ہے۔ اگرچہ انسان کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کرٹھانی میں ہے۔ لیکن ہمیشہ جنگلی مرغے کی مانند خونخوار اور چوکنار ہونا پڑتا ہے۔ اور ہر وقت بادشاہ اور وزیر کے

ٹانگ کھینچنے کے ساتھ ساتھ عوام سے بھی پیٹنا ہوتا ہے۔
 میں نے جس طرح ممکن ہو سکا بڑی آبرو مندی کے ساتھ چند
 سال سیاست کی دنیا میں گزار دیئے۔ تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ
 یہ سکھ کی سچ نہیں کانٹوں بھرا بستر ہے۔ اس لئے دھیرے دھیرے
 مرکز کے ہنگاموں سے دوڑنا مین کے پرسکون علاقہ میں بیوی بچوں
 کے ساتھ اپنی ایک خوش و خرم دنیا آباد کر لی۔ اب ایک عرصہ سے
 عیش کی زندگی گذر رہی ہے۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ میرا بیٹا بھی ابھی
 کچھ روز قبل شہر کے اعلیٰ حکام میں سے ہو گیا ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ
 سرور و کامران اور ہم بھی اپنی جگہ مطمئن اور پرسکون۔
 آپ سے بھی درخواست ہے کہ آج کے بعد مجھے سیاسی آدمی
 نہ سمجھیں اور نہ کبھی اس نام سے یاد کریں۔

برلن ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۶

سعید نفیسی

شاعر، ناول نگار، داستان نویس، محقق، مترجم، مورخ اور لغت نویس، ان سب شخصیات کے بہترین امتزاج کا نام سعید نفیسی ہے۔ استاد نفیسی ۱۸۹۷ء تہران میں پیدا ہوئے۔ تقریباً انہتر سال کی عمر ۱۹۶۶ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد یورپ چلے گئے۔ ۱۹۱۶ء ایران واپسی پر حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے۔ علاوہ از ریض قانون، تاریخ اور ادبیات کے استاد بھی رہے۔ اور نہ صرف ایران بلکہ غیر ملکی درسگاہوں میں بھی درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے کے ساتھ جدید فارسی نثر کے دامن کو نئے افکار اور طرزِ ادا سے

پر بار کیا۔

سید نفیسی نے بڑی حساس اور نازک طبیعت پائی ہے۔ ان کو اپنے ماضی سے حد درجہ محبت اور وطن پرستی کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ اپنے آباء و اجداد کی ان یادگاروں پر غور ہے جو دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئیں۔ اب چاہے وہ قدیم عمارات ہوں یا مٹی ہوئی 'مشرقی تہذیب'، ان کو اپنے تمدن کی اعلیٰ و تدریج کا شدت سے احساس ہے۔ یہی کرب ان کے یہاں مغرب کی مشینی اور مادی اثرات سے بوجھل تہذیب کے خلاف ایک باغیانہ آواز بن کر ابھرا ہے۔ وہ تہذیب نو سے گریزاں اور پرانی روایات و اقدار سے پوری طرح وابستہ نظر آتے ہیں۔

مؤلف کا دور مغربی اثرات اور غیر ملیکیوں کے تسلط کا زمانہ ہے۔ کوآئیس کی چال چلتا ہے تو اپنی بھی بھول جاتا ہے۔ یہی غم ان کو ڈستا رہا اور اس ہی زہر کی پاداش میں "اذانِ مغرب" اور "خانہ پدری" جیسے افسانے جنم لیا کرتے ہیں۔

نفیسی کی ادبی اور دیگر علمی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کا شمار کثیر التصانیف ادیبوں کی فہرست میں کیا جاتا ہے۔ موصوف کی چند تصانیف بہ قرار ذیل ہیں:

ماہِ نخب، فرنگیس، بابک خرم دین، ستارگانِ سیاہ، فرہنگِ نفیسی، تاریخِ اجتماعی سیاسی ایران دورہ معاصر (دو جلد)، فرہنگِ جامع فرانہ بہ فارسی، شرح احوال و آثار رودکی وغیرہ۔

اذانِ مغربؑ

کیسپین دریا کے ساحل پر چمکتا ہوا تانبہ بناک سورج شاعر کی طبیعت میں ایک روانی پیدا کر دیتا ہے۔ خاص طور سے اس کے مغربی کناروں پر آفتاب کی حدت و حرارت کے سبب ہوا میں ایک لطافت آجاتی ہے۔ پہاڑی دامن کی زرخیز چھپی وادی میں مغربی انداز کی جدید وضع قطع والی عمارتوں سے سجایا ایک ایرانی شہر آباد ہے۔ ایک گل اندام دوشیزہ کی مانند یہ شہر کبھی خوشیوں سے معمور اور گاہے غم کا شکار رہا ہے۔ سمت در کی پرسکون نیلی سطح اور مشرق کے علاقوں سے بے نیاز زمین کی چھاتی پر پھیلی اس کی صاف

شفاف گلیاں، رنگارنگ مشرقی حسن کے مکان سنہری چمکدار سورج کی روشنی میں نہلے کھڑے ہیں۔ قفقاز کا یہ چھوٹا سا شہر دو ہزار سال سے اپنی سرسبز و شاداب آب و ہوا پر نازاں ہے۔

در بند ایک چھوٹا سا شہر ہے، جس کو ایرانیوں نے اپنی تہذیب کی ابتداء میں تعمیر کیا تھا۔ یہ شہر اپنی جغرافیائی نوعیت کے اعتبار سے ہمیشہ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک حصار کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ اور آج بھی انوشیرواں کے زمانہ کی مضبوط سنگین فصیلیں سال خوردہ پہاڑ کے سینے پر دھری ایرانی سپاہیوں کی بہادری اور شجاعت کی ضامن ہیں۔ اسلامی دور حکومت میں اس علاقہ کو ایران کی سرحدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ شہر کی چار دیواری میں مقید مساجد امام باڑے اور رنگارنگ میناروں کا فن تعمیر آج بھی ایران کے چابک دست مہماروں کی فنکاری کا غماز ہے۔ غازیانِ خاں نے ایرانی شاعر کی یادگار کے طور پر اس کے روح پرور میدانوں میں کاشی کاری سے مزین مسجدیں اور امام باڑے بنوائے۔ سلطان محمد خاں بندہ نے اس کے زرد دیوار کو ایران مہاروں کے دلنواز ذوق اور نقاشوں کے زرخیز قلم سے منقش کرا کے اس کو نیا سن بننے کے ساتھ ساتھ جاذبِ نظر فنِ معماری کی نہایت عمارتیں پہاڑ کے دامن میں تعمیر کرائیں۔ اور آج یہ شہر قفقاز کے کارخانوں کے درمیان بحرِ نزر کی بندرگاہ پر آنے جانے والے بہرازدوں کے

شور و غل سے گھرا بطور یادگار باقی ہے۔

جنوب سے دریائے خزر کی شمال کی جانب جانے والا جب نیلے گنبدوں اور آسمان سے باتیں کرتے رنگارنگ میناروں کو مغربی تمدن کی علامت کوٹے اور تیسل کی بو سے آلودہ دیکھتا ہے تو انتہائی تعجب کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ان دو تہذیبوں کے بیچ آپس میں کیا تال میل ہے۔

دہراں ستمگر کی مانند یہ بے وفا شہر اگرچہ اپنے پرانے عشاق سے تعلق توڑ چکا ہے۔ پھر بھی ابھی تک ایرانی تمدن کی دلنواز جادوگری کو یکسر اپنے ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ البتہ اس صدی کے آخری حصہ میں اس میں کچھ کچھ کمی آرہی ہے اور اس نے اپنی ایک پرانی خصوصیت، اذان کی دلفریب صدا کو ہاتھ سے گنوا دیا ہے۔

جب سے یہ شہر ایرانیوں کے ہاتھ سے نکلا تب سے آج تک نہ کسی کجلانی صبح میں، نہ کسی پر تمازت دوپہر اور سکون بخش سہ پہر میں، نہ شام کے دھندلکوں میں جب آفتاب خدا حافظ کہنے کو ٹھہر گیا ہو، نہ شب کی تاریکی میں بدبخت اہل در بند کے کانوں میں مؤذن کی عاشقانہ دلنشیں دھیمی دھیمی آواز نہیں پہنچی ہے۔ اور وہ مشرق کے اس روح نواز جلت رنگ سے محروم رہ گئے ہیں۔ یہ فرحت بخش نغمہ جو ہزار چہکتی بلبلوں کے زم زموں سے معمور ہے مدت سے اس بد قسمت شہر کی فضاؤں میں نہیں گونجا۔

تقریباً چار دہائیاں گزرنے کو آئیں در بند کا ایران سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی سال سے اس شہر کے گلی کوچہ غم و اندوہ میں ڈوبے ہیں۔ اس کے ہونٹوں کی بناوٹ ^ط مسکراہٹ صرف اپنی اس مشرقی رواداری کی امین ہے جو کبھی اپنی اندرونی تکلیف کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔

عرصہ سے در بند کے جھکے نیلے آسمان کے نیچے، لمبی عباؤں میں ملبوس باوقار مسکراتے چہرے، اونچی ترکی ٹوپیاں، خوبصورت ذہین بچوں کے سنہری بال، عورتوں کی کالی چادر سے جھانکتی دل کو لہجانے والی کماندار بھنویں، ڈھونڈنے پر بھی خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اتفاقاً کبھی — اس طرح کے دلکش، جاذب نظر منظر یا مسکراتے چہرے پر نگاہ پڑتی بھی ہے تو وہاں زندگی کی خوشی و مسرت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

اسی شہر کی ایک چھوٹی سی دکان کے اندر ایران کی پرانی تہذیب کی یادگار ایک بوڑھا، اپنے دل میں آرزوؤں کی دنیا بسائے زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ وہ منتظر ہے کہ بہار بھی آئے گی اور ایک دن اس کی حسرتوں کے مرجھائے پھول ^ط سل اٹھیں گے۔

علیقلی کے پاس وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنی جوانی کی اب ایک ہی خوبصورت یاد باقی رہ گئی ہے۔ جس کے عشق

نے اس کو زندگی کے طولانی ستر سالوں کا سفر کرادیا ہے یہی عشق
اس کی روحانی مسرتوں کی جان اور اس کے محنت کش فاقوں کے
مارے لاغر بدن کی روح ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو اس کو ہر روز صبح
کشاں کشاں دکان پر لے آتا ہے اور پھر دن ڈھلے پڑمردہ قدموں
سے رواں دواں گھر پہنچا دیتا ہے۔ ایک عاشق ہی اس رمز کو
سمجھ سکے گا کہ زندگی کے یہ ستر برس اس نے کس طرح گزارے
ہیں۔

اس کا عشق کسی دلبر محبوب کی پرکشش غزالی آنکھوں سے
نہیں، نہ ہی وہ کسی کی خوب صورت سنہری زلفوں کا اسیر ہے۔
اور نہ ہی کسی کے موزوں قد و قامت نے اس کو شکار کیا ہے اور
نہ کسی کی شیریں بیانی نے لوٹا ہے۔ یہاں تک کہ کسی نے اس کے
معشوق کو خاک میں بھی نہیں ملایا ہے۔ بلکہ اس کے معشوق کا مدفن
تو در بند کے کہنہ سال بوڑھوں کا سینہ ہے۔

اس کے عشق کی پرورش ماں کے خون اور اس کی سچائی
باپ کی روح سے وابستہ ہے۔ اس کا نرالا عشق تو اپنے آبا و اجداد
کی روایتوں اور قدروں کا دیوانہ اور ان کا متلاشی ہے۔

اس کے باپ نے اس کو بتایا تھا کہ در بند کی سرزمین جب
ایرانیوں کے ہاتھ سے نکل گئی تو نئے حاکموں نے اس کے دو جوان
چچاؤں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کی ماں نے اس کو پالنے

میں جھلاتے وقت خون کے آنسوؤں میں ڈوبی اس کے باپ
بھائیوں کی یادوں کو لوری کی شکل میں سنایا تھا۔ اس کی ماں
کے اشک زمین میں جذب نہیں ہوئے بلکہ وہ بھاپ بن کر اٹھے
اور اس کے سینے کی تہوں میں پیوست ہو گئے۔ اور اس کے دل
میں شدید قسم کی نفرتوں کو جنم دیا۔

یہ عشق اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پانچوں وقت خشوع و
خضوع کے ساتھ اپنے مالک کی بارگاہ میں سر جھکا کر اس سے
شکوہ کرے۔

در بند شہر کے وسط میں آباد عیسائیوں کا گرجا گھر
اور میخانہ کی رونقیں اس کے جذبات کو اور بھڑکاتی ہیں۔
اگرچہ عیقلی کو اپنی زندگی سے اب کوئی رغبت نہیں رہ گئی
اور وہ اس سے تنگ آچکا ہے مگر صرف ایک آرزو کی تکمیل کے
لئے وہ زندگی کے بوجھ کو ڈھونڈے جیسے چلا جا رہا ہے۔

اب سے تیس سال پہلے وہ اپنے کسی عزیز سے
ملاقات کے لئے اپنے آبائی وطن تبریز دو ہفتہ کی مدت کے لئے
گیا تھا۔ جہاں صبح و شام ہر نماز کے وقت مسجد سے بلند ہو کر فضا
کو فرحت بخش بنانے والی مؤذن کی آواز نے چند دنوں اس کے
کانوں کے پردوں کو خوشیوں کی نئی حرارت بخشی تھی۔ اس آسمانی
دل نشیں نغمہ نے اس کو اپنا اس طرح گرویدہ بنایا کہ پھر زندگی میں

دوبارہ وہی نغمہ سننے کے علاوہ اور کوئی تمنا باقی نہیں رہ گئی۔ وہ صرف اس روح پرور آواز کو سننے کے لئے زندہ ہے۔ وہ زندگی کی سانسیں اس مشروط آرزو کے ساتھ لے رہا کہ کبھی تو اس شہر میں وہی فرحت بخش شیریں نغمہ فضا میں گونجے گا اور موت کے آخری لمحوں تک اس کے کانوں سے ٹکراتا رہے گا۔

اس ہی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پچیس سال قبل جنوبی محلہ میں واقع اس نے اپنے باپ دادا کے مکان کو بیچ کر شہر کے غربی علاقہ میں مشہور مسجد خان کے قریبی مکان میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ صرف اس امید کے سہارے کہ شاید کبھی تو مسجد خان کے رنگ برنگے میناروں کی چوٹیوں سے مؤذن کی آواز بلند ہو کر اس کے کانوں میں خوشیوں کا رس گھولے گی۔

لیکن یہ سب خیال خام ہے۔ بھلا نئی تہذیب کا مؤذن کی پرسوز یکساں لے سے کیا تعلق؟ در بند تو وہ متمدن شہر ہے جو اب پرانی قدروں کے حصار سے آزاد ہو چکا ہے۔ تو پھر ایسے دقیانوسی شخص کے وجود کو وہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے جو سر پر پگڑ لپیٹے پھیٹی عبا میں ملبوس ہو۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔

نہ۔۔۔ ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اے بوڑھے مویجی تمہاری آرزو ایک دن تمہارے ساتھ تمہاری قبر ہی میں چلی جائے گی۔

دیلقان کا مکتب دار ملا رجب علی جس کے چہرے بھائی کو دو ماہ پہلے دربند کے پرانے قبرستان میں دفنایا گیا ہے وہ جائیداد پر قبضہ لینے کی غرض سے دیلقان سے دور دراز کی راہ طے کر کے دربند آیا ہے۔

دو تین دن سے زیادہ وہ اس شہر میں رکنے والا نہیں۔ آج وہ اپنی سنہری گھاگرا جوتیوں (ساغری چیلوں) کو ٹکوانے کے لئے علیقلی کی دکان پر آیا ہے۔ کیونکہ دربند جیسے ترقی یافتہ شہر میں ایسا کوئی دوسرا نہیں جو دیلقان کے مکتب دار کی پرانی جوتیوں کی مرمت کر سکے۔

پہلا ہی سوال علیقلی نے دیلقان مکتب دار سے یہی کیا کیا آپ اذان دینا جانتے ہیں؟

یقیناً کیوں نہیں۔ دیلقان کے لوگ مدتوں سے اس حنین آواز کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ رمضان المبارک کی کتنی راتوں کی صبح اس کی اذان کے مرتعش آہنگ سے ہونی ہے۔ اس کی پرسوز آواز نے رات کے اندھیروں میں نہ جانے کتنے نومولود بچوں کے کانوں میں مبارکباد کہی ہے۔ اور دیلقان کے کتنے مرد، عورت، بوڑھے، بچے اس کی اذان سن کر کہنیوں تک آستین چڑھائے حوض کے کنارے وضو کرنے کو بیٹھے ہیں۔

ملا رجب علی اذان دینا جانتا ہے۔ اس مثبت جواب کو سن کر

افسردہ ہوڑھے موجی کی آنکھوں میں جو چمک آئی آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

علیقلی کو اپنی ماں سے وراثت میں یزد کا سرخ بٹوا ملا تھا جس کی کل پونجی دوا شرفیوں سے زیادہ نہیں تھی۔ دو گھسی گھسانی اشرفیاں جس پر کندہ تحریر "السلطان نادر شاہ افشار" کو بمشکل تمام پڑھنا جاسکتا تھا۔ یہ وہ اشرفیاں تھیں جنہیں علیقلی کی دادی نے اس کی ماں کو شادی کے موقع پر منہ دکھائی میں دی تھیں۔ یہ سنہری اشرفیاں اپنی تاریخ کے اعتبار سے علیقلی کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھیں۔ اپنے اس خالص حلال مال کو اس نے بڑی احتیاط سے اپنے کفن کے استعمال کے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ بارہا وہ اپنے دوستوں کو وصیت کیا کرتا، دیکھو جب میں مرجاؤں تو میرے تیکہ کے نیچے سے سرخ بٹوے کو نکالنا اس میں دو نادر شاہی اشرفیاں رکھی ہیں۔ ان ہی کے ذریعہ میری تجہیز و تکفین کا بند و بست کر کے مسجد خان کے پاس والے قبرستان میں دفن دینا۔

لیکن آج اس ہی سرخ یزدی بٹوے کو علیقلی نے اپنے ہاتھوں تیکہ کے نیچے سے نکال کر دیہقانی مکتب دار کے سامنے پیش کر دیا کہ وہ اس ہدیہ کے عوض مغرب کے وقت مسجد خان کے مینار پر جا کر اس اذان کی آواز کے امرت کو اس کے کانوں میں انڈیلے جس کو سننے پچیس سال بیت گئے۔ اور اس انتظار میں وہ موت کے بلاوے کو ایک

مدت سے آج اور کل پر ٹالتا آ رہا ہے۔

مغرب کے وقت مسجد خان کے بلند منار سے ملا رجب علی کی
آواز اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ کہتی ہوئی فضا
میں گونجی۔

علیقلی کے لئے یہ آواز کیسی روح پرور تھی مگر افسوس اس آواز
کے کانوں میں پڑنے کے چند لمحوں بعد اس کی روح قفسِ عنبری سے
پر واز کر گئی اور اذان کے آخری متبرک کلمات کے ساتھ ساتھ علیقلی
کی موت کی خبر در بند میں چاروں طرف پھیل گئی۔

اگلی صبح علیقلی کے جنازے کو میونسپلٹی کے خرچ پر سپرد خاک
کر دیا گیا۔ اس لئے کہ وہ دوا شرفیاں جن کا ذکر بوڑھا موجدی ایک
خاص جذبے کے ساتھ کیا کرتا تھا وہ تکیہ کیچے سے نہیں نکلی تھیں۔
اور علیقلی کو دفنانے کے ساتھ ساتھ دیلقانی مکتب دار کو بھی شہر سے
باہر نکال دیا گیا۔

اپنا وطن

آج سے تقریباً سنی سال پہلے کی بات ہے جب ایرانیوں کی قدیم نسل کی نشانی، ایک بوڑھا ہرات میں رہا کرتا تھا۔ دہخوارقان کا یہ بوڑھا نصر اللہ اپنی زندگی کی چوتھڑے ساریں دیکھ چکا تھا۔ زمانے کے تغیرات نے اس کو ہرات میں لاپٹ کا جہاں وہ اپنی گذراوقات کے لئے قلی گیری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔

نصر اللہ کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جن کو دنیا اور اہل دنیا سے کوئی راہ و رغبت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ تو بچپن

میں یتیم ہو گیا تھا اور شادی بھی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ خاندانی اور انسانی تعلقات ان سے وابستہ احساسات اور جذبات کیا چیز ہوتے ہیں۔ پس ان سب کو وہ لغو اور بے معنی تصور کرتا، یہاں تک کہ اگر کسی گلی کوچہ میں دیکھتا کہ ایک ماں اپنے شیرخوار بچے کو سینے سے چمٹائے پیار کر رہی ہے تو یہ منظر تعجب کے ساتھ اس کی طبیعت میں ایک کراہیت پیدا کر دیتا۔

اس کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہر رات جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جاتی وہیں بسر کر لیتا۔ اسی سبب کسی مقام سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اور اس کی تمیز بھی نہیں تھی کہ فلاں جگہ رہائش کے لئے فلاں جگہ سے بہتر ہے۔

الغرض یہ بوڑھا آدمی ان آزاد اور لاپرواہ لوگوں میں سے تھا جو نہ خود کسی سے تعلق خاطر رکھتے ہیں اور نہ کسی کی محبت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ اکثر کہتا دنیا میں کوئی چیز بھی اس قابل نہیں جس سے جذباتی رشتہ جوڑا جائے۔ پس اگر اس جہان سے خدا حافظ کہنے کا وقت آن پہنچا تو کوئی تعلق اس کی راہ کا روڑہ نہ بن سکے گا اور وہ بغیر کسی شش و پنج اور تأسف کے اپنا رخت سفر باندھ لے گا۔ نصر اللہ کے یہی خیالات اور عقائد کسی سے دوستی اور آشنائی میں مانع ہوتے تھے۔

خراسان میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ عرصہ تک تو ایرانی فاتح رہے لیکن آخر کار انہوں نے دشمنوں کی بالادستی قبول کرتے ہوئے ان کے آگے سپر ڈال دی۔ اور ہرات کے ساتھ ساتھ اس کے قریب وجوار کا بہت سا علاقہ انگریزوں کو دے دیا۔

شکست کی اس افسوسناک صورت حال سے تمام اہل ہرات دل گرفتہ اور پریشان تھے۔ صرف نصر اللہ کی واحد ذات کے جس پر اس سانحہ کا کوئی اثر نہ تھا۔

شکست و ریخت کے نتیجہ میں شہر کے بااثر اور ثروت مند لوگ حب الوطنی کے جذبہ کے باوجود ہرات کو ترک کرنے اور خراسان کی راہ پکڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اور تھوڑی بہت جو بھی جائیداد ان کے پاس تھی اس کو اونے پونے دامنوں میں بیچ بیچ مشہد اور ایران کے دوسرے شہروں میں اپنے لئے سر چھپانے کی جگہیں تلاش کرنے لگے۔ نصر اللہ کا کام کیونکہ قلی گیر می تھا لہذا سفر و مسافرت کی کثرت سے بہت بڑھ گیا۔ اور اس کی روز آنہ کی آمدنی اندازہ کے حدود سے بھی آگے نکل گئی۔

تھکانے دینے والے کام سے فراغت پا کر راتوں کو جب نصر اللہ قہوہ خانوں کی محرم فضا کے اندر بحث و مباحثہ کی محفلوں میں شریک ہوتا تو بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے ہم شہریوں کے اس رویہ کی مذمت کرتا کہ وہ کیوں اپنی مال و متاع کو تھپس تھپس

کر کے اپنے وطن کی سر زمین کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق وہ لوگ واقعی دیوانے ہو گئے ہیں جو عمر کے آخری حصہ میں سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کو تیار اور اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی سے صرف ایک احساس کے تحت ہاتھ دھو رہے ہیں۔ وہ سوچتا کیا تمام جگہ خدا کی زمین نہیں ہے پھر ہرات اور مشہد میں کیا فرق؟

نصر اللہ کو تو زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ جب یہ حضرات اپنی رضا و رغبت سے جا رہے ہیں تو پھر افسردگی اور دل گرفتگی کس وجہ سے ہے۔ کسی نے ان کو جانے پر مجبور تو نہیں کیا؟ اگر انھیں اپنے گھر اور وطن سے محبت ہے تو کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ حکیم نے نسخہ میں تو نہیں لکھا۔

نصر اللہ کی جان پہچان والوں اور ہرات کے بوڑھے تجربہ کار لوگوں نے ہر چند یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے وطن اور جائے پیدائش سے محبت کرنا انسانی فطرت کے عین مطابق اور اس کو ترک کر کے غریب الوطنی اختیار کرنا کاردار دہے۔ لیکن نصر اللہ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی اور نہ آئی۔ وہ اپنی رائے پر اٹیل ٹوکی مانند ڈھٹا رہا۔

ایک دن ہرات کے صاحب حیثیت لوگوں میں سے کسی نے اس کو بلایا اور کہا: دیکھو نصر اللہ اب تم بوڑھے ہو گئے ہو اور عمر

ڈھلنے کے ساتھ تمہارے اندر پہلی جیسی محنت و مشقت کرنے کی
 نہ قوت رہ گئی ہے اور نہ صلاحیت۔ پھر میں نے بھی لاچار فیصلہ
 کر ہی لیا ہے کہ ہرات کو خدا حافظ کہوں۔ میری ملکیت شہر سے باہر ایک
 باغیچہ ہے۔ میرے جانے کے بعد کوئی اس کا پرسان حال نہ ہوگا۔
 کیونکہ ہجرت کر کے اتنی بڑی تعداد میں اہل ثروت جا چکے ہیں،
 کہ اب کوئی ایسا نہیں رہ گیا کہ اس کو خرید لے۔ چاہتا ہوں اپنی
 موجودگی میں وہ باغیچہ تمہارے حوالہ کر دوں۔ میرے جانے کے
 بعد نہ جانے کیا صورت حال رونما ہو۔ پس تم جتنی جلدی ممکن
 ہو میری آنکھوں کے سامنے اس کی ذمہ داری سنبھال لو۔ اس کے
 اطراف میں جو مزید میری ملکیت ہے اس کی آمدنی تمہاری روٹی
 روزی کا ذریعہ بنی رہے گی اور تم عمر کے آخری حصہ میں ذریعہ
 معاش کے حصول کی بھاگ دوڑ سے آزاد، آرام سے زندگی کے
 باقی ماندہ دن کاٹ سکو گے۔

نصرا لٹہ کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ وہ آہستہ آہستہ بوڑھا
 ہو رہا ہے۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں، وہ تو خدا سے چاہتا
 تھا کہ ایسے وسائل اس کو میسر آجائیں کہ وہ زندگی کے بچے کھچے ایام
 کو بے فکری سے گزار سکے پس اس نے فوری پہلی فرصت میں
 اپنے مختصر مال و اسباب کو سمیٹا اور شہر کے باہر باغیچہ کی
 راہ لی۔

اپنی پرانی عادت کے مطابق وہ روزانہ صبح سویرے بیدار ہو جاتا اور دن بھر پوری تندہی کے ساتھ باغ کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔ جب کام کرتے کرتے تھک جاتا تو سوچوں میں گم، باغ کے درمیان بہنے والی نہر کے کنارے سستانے کو بیٹھ جاتا۔ اسی غورو منکر کے دوران اکثر اس کے ذہن میں نئی نئی چیزیں آتیں۔ ایک دن اس ہی کیفیت کے بیچ اچانک نہر کی تہہ میں بیٹھے ہوئے کنکروں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس کو لگا پانی کی گہرائی میں وہ پتھر پڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اپنا گھر بنائے ہیں۔ ہمیشہ پانی کے دباؤ سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی طور آمادہ نظر نہیں آتے کہ پانی اپنے ریلے کے ساتھ ان کو بہا لے جائے۔ لیکن تاکجا؟ پانی کے فشار کے آگے اگرچہ وہ مات کھا جاتے ہیں۔ پھر بھی پیچھے کی اور ان کے پلٹنے کی جدوجہد جاری رہتی ہے۔ اور وہ محل چل کر زور لگاتے ہیں کہ دشمن کے چنگل سے خود کو آزاد کر لیں۔ مگر کہاں۔۔۔ زور زبردستی کے شکار، گھوم گھوم کر بڑی حسرت کے ساتھ وہ اپنے گھروں کو تکتے، بہہ جاتے ہیں۔

بالآخر وہ دن بھی آن ہی پہنچا جب انگریزوں نے ہرات کو پورے طور پر اپنے تسلط اور تصرف میں لے لیا۔ اور ہجرت کر کے جانے والے لوگوں کی املاک پر اپنا قبضہ جمالیا۔ باغیہ خان بھی ان کی نگاہ کرم سے نہ بچ سکا۔ اور بیچارہ نصرا لشد بھی چار و ناچار مجبور

ہو گیا کہ باغیچہ کی ذمہ داری اور دیکھ بھال سے اپنا ہاتھ اٹھالے اور اس کی ملکیت سے دستبردار ہو جائے۔ کیونکہ نئے مالکوں کی نظر میں بوڑھے دہخوار قانی کی پاسبانی کی ضرورت اب اس باغیچہ کو رہی نہیں تھی۔ بہر حال مرزا کیا نہ کرتا، نصر اللہ کو خان کا باغیچہ تیاگنا ہی پڑا۔ اب نہ نصر اللہ کو باغیچہ پر اختیار تھا اور نہ دل پر قابو۔ خود داری بالائے طاق رکھ بے اختیار باغیچہ کی طرف نکل جاتا اور اس کے بڑے سے دروازے کے سوراخوں سے اندر جھانک کر تا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آزاد منش بے گھر نصر اللہ کا دل اب نہیں چاہتا تھا کہ باغیچہ کی حدود سے دور چلا جائے۔ اپنی چیز سے محبت کا جذبہ کیا ہوتا ہے یہ بات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی۔ اپنے باغ کے گل بوٹوں اس کی بہاروں اور چمن زاروں کا منظر جب بھی اس کو یاد آ جاتا تو بے ساختہ نئے حاکموں پر وہ لعنت و نفرس بھیجتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اکثر بھوٹ بھوٹ کر رو پڑتا۔

قہر و دیش بجان درویش۔ وہ زندگی کی گذراؤات کے لئے دوبارہ سے فتلی گیری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا لیکن آج کے اس فتلی اور دو ماہ پہلے والے قلی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ لا پرواہ اور بے نیاز نصر اللہ جس کے لئے دوستی و دشمنی کے جذبات کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ اب وہ نئے مالکوں کے بوجھ کو دل پر جبر کر کے غم و غصہ کے عالم میں ڈھوتا۔ اور اکثر اس کا دل چاہتا

ان کے سامان کو حثارت کے ساتھ زمین پر پٹک دے، تو رڈ اے،
نصر اللہ کی ساری دشمنی ارباب سامان سے یہی تھی کہ کیوں انہوں
نے اس کا عزیز باغیچہ چھین کر اس کو بے دخل کر دیا ہے۔

ایک دن اچانک ہی اس کو خان کے باغیچہ کے درمیان بہنے
والی نہر کی تہہ میں بیٹھے ہوئے ان پتھروں کی یاد آگئی جو پانی کے دباؤ
میں گرفتار اس کوشش میں لگے تھے کہ خود کو اس کے چنگل سے
آزاد کرالیں۔ اور کسی صورت اپنی جگہ چھوڑنے کو آمادہ نظر نہیں
آتے تھے۔

اس دن کے اگلے روز کسی نے نصر اللہ کو ہرات میں نہیں دیکھا۔
دو ماہ کے بعد جو لوگ نصر اللہ کی جوانی و ہوارقان میں دیکھ چکے
تھے۔ انہوں نے ایک پھٹے حال اجنبی بوڑھے کو وہاں دیکھا جو گرد آلود
سامان کی پوٹلی کو کندھے پر رکھے لاٹھی ٹیکتا ہوا، نصر اللہ کے باپ
رجب علی کے گھر کا پتہ پوچھتا پھر ہاتھا۔

علی دشتی

علی دشتی نے ۱۸۹۵ء/۱۲۷۴ھ ش کربلا جیسے مقدس مقام میں آنکھیں کھولیں۔ ان کا شمار جدید فارسی نثر نگاروں کی اولین فہرست میں کیا جاتا ہے۔

”شفق سرخ“ روزنامہ کی اشاعت نے دشتی کو ادبی حلقوں سے روشناس کرایا۔ افسانوی مجموعہ ”فتنہ“ کو ان کی شہرت کا نقطہ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

ادیب و محقق ہونے کے ساتھ ساتھ علی دشتی کا سیاسی زندگی سے بھی تعلق تھا۔ وہ سیاسی قیدی بھی رہے اور قیدی زندگی کے تجارب کو انہوں نے ”ایام محبس“ تصنیف کے اندر سمودیا ہے۔

علی دشتی کو عورتوں کے احساسات و جذبات کے بیان کرنے کی پوری قدرت حاصل ہے۔ خاص طور سے مغربی تہذیب کی ماری اور

اور طبقہ بالائی شکار خواتین ان کا افسانہ مرگ مادر ایک منظر مظلوم عورت کے احساس و جذبات کا بھرپور مرقع ہے۔

ایران میں تنقید کے موضوع کو کم چھوا گیا ہے۔ علی دشتی کا نام اولین ناقدوں میں بلا کسی جھجک اور تکلف کے لیا جاسکتا ہے۔
کچھ تصانیف درج ذیل ہیں :

سایہ، جادو، نقشی از حافظ، در قلمروی سعدی، سیری در دیوان شمس، شاعری دیر آشنا خاقانی، دی باخام، اعتماد بنفس (ترجمہ) وغیرہ

مال کی موت

اے اپنے آپ کو مظلوم و مسکین سمجھنے والے، دو پیروں کے حیوان، تم خود کو محض قوت گویائی کے سبب اشرف المخلوقات گردانتے ہو، اگر بھیڑیوں کے منہ میں بھی زبان ہوتی تو وہ بھی بول اٹھتے کہ تم خدا کی سر زمین پر سب سے بڑے شیطان ہو تمہاری پوری زندگی کا دامن کالے کرتوتوں سے داغ دار ہے۔

افسوس! اگر حضرت محمد اور عیسیٰ علیہ السلام سانپ اور چیتوں پر پیغمبر بنا کر بھیجے جاتے تو ان کی تعلیمات کا کہیں بہتر نتیجہ برآمد ہوتا۔ لیکن تمہاری دنیا میں سوائے خود پسندی، نفسا نفسی اور

شرمناک جرائم کے علاوہ اور کیا دھرا ہے۔

اگر تمہاری لفاظی اور مصلحت پرست جھوٹ کا پردہ فاش کر دیا جائے جس کو تم اپنی شرافت کا نام دیتے ہو تو تمہاری فطرت قوی ہیکل درندوں سے بھی زیادہ خوفناک اور موزی کیڑے مکوڑوں سے بھی بڑھ کر زہریلی اور پست و تاریک ثابت ہو۔

سطح زمین کے کسی بھی کونے میں اور سمندروں کی اقصاء گہرائیوں میں ذرہ برابر بھی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی جاندار بھوک سے مرجاتا ہو لیکن تمہاری فتنہ و فساد سے آلودہ اندھی ننگری میں ہزاروں افراد ایسے ہیں جو تمہاری خوش حال زندگی کے باوجود تمہاری بے رحمی اور سنگ دلی کے سامنے بھوک سے ہلک کر روٹی کے ایک لقمہ کے لئے ترستے ہوئے بدترین موت کے زہر کو آب حیات سمجھ کر پی جاتے ہیں۔

ان تمام پریشانیوں کا نظارہ کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ امریکہ اور افریقہ جانے کی زحمت گوارہ کی جائے بلکہ یہیں اس ہی پرسکون نظر آنے والے تہران میں جو بظاہر خوشیوں سے لبریز ہے یہ تلخ حادثات کثرت سے پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کوئی داستان اور افسانہ نہیں بلکہ ایک سچا واقعہ ہے جو کل اس ہی تہران میں ہماری اور آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا۔ اگرچہ حادثہ کے جنم داتاؤں نے کوشش کی تھی کہ اس پر پردہ

پڑا رہے مگر اتفاقاً میرے ایک دوست کو خبر ہو گئی اور اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ شرافت کی مقدس سرزمین پر گرنے والے بدقسمتی کے ان ہزار آنسوؤں کے ایک قطرہ سے آپ کو روشناس کرادوں جو ظلم کی پیاسی دھرتی میں یوں جذب ہوئے کہ ان کا وجود ہی کھو گیا۔

سماج میں اپنے مقام کی متلاشی اور اپنے حقوق کی طلب گار صنف نازک، اپنی ایک بدقسمت بہن کی درد بھری داستان سنجوس کی جوانی سے ایک ظالم مرد — کھیلتا رہا اور جی بھر کر اس کی جوانی کا مزہ لوٹا۔ اور پھر چند بچوں کا بوجھ اس کے ناتواں کاندھے پر ڈال کر اسے موت کے چنگل میں جانے کے لئے مجبور کر دیا۔

ماؤ تمہیں چاہئے کہ اپنی اس پاکدامن اور بدقسمت بیٹی کی قبر پر آنسوؤں کے موتی پھراور کرو جو ایک لالچی اور ہوس پرست مرد کے ظلم کا شکار ہو گئی۔

”امین حضور“ ترا ہے سے پہلے ٹریفک لائٹ کے قریب ایک گلی ہے جس میں ایک سپہ سالار کا گھر آباد ہے، چند روز پہلے ہی کی بات ہے جب یہ گھر ایک عورت اور چند بچوں کی رہائش کا ٹھکانہ تھا۔

نہ جانے پہلے اس گھر میں کتنا اثاثہ تھا، کتنے کمرے تھے اور وہ کس طرح آراستہ و پیراستہ تھے۔ لیکن آج کی اس بر فیلی اور

اور تاریک رات میں جب یہ گھر ایک بذخست اور منکسوم عورت کا دفن بن گیا تو یہ اثاثہ سے پوری طرح خالی تھا۔ اور ان کمروں میں سوائے رات کے اندھیلے اور سرد ہوا کے جھکڑوں کے علاوہ کوئی اور چیز آباد نہ تھی۔ یہاں تک کے باورچی خانہ بھی آگ کی چنگاری، راکھ اور دھوئیں سے خالی تھا۔ الغرض گھر کا پورا وجود تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف ایک کمرے میں لیمپ کی ملگجی بیمار روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بظاہر یہی کمرہ اہل مکین کی رہائش گاہ معلوم پڑتا تھا۔ جس کے آدھے حصہ میں فرش بچھا تھا اور پھٹا قالین بھی ایک چھوٹی سی چوکی رکھی ہوئی تھی۔ چوکی کے ایک طرف چند معصوم بچے ٹو خواب تھے اور دوسری طرف ایک عورت حزن و یاس کا مجسمہ بنی حسرت و اضطراب میں ڈوبی نظروں سے اپنے بے گناہ منکسوم بچوں کو تک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بتیابی کے ساتھ اٹھی اور ایک اضطرابی کیفیت کے ساتھ سر بچے کے منہ کو چوما اور اپنے محبت و شفقت سے معمور چہرے کو ان کے بالوں میں چھپا کر ٹھنڈی آہیں بھرنے کے بعد کمرے سے باہر آکر ستاروں سے جگمگاتے آسمان پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر پلٹ کر کمرہ میں داخل ہوئی بچوں کے منہ کو بوسہ دیا اور تیزی کے ساتھ دوبارہ باہر نکل گئی۔ تاریک صحن کے ایک گوشہ میں کانپتی ٹانگوں پر کھڑی سوچ و بچار میں غرق وہ اپنے نفس سے جھکڑتی رہی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی پھر کمرے میں

میں واپس آگئی۔

میں نہیں جانتا رفت و آمد کا یہ عمل اس رات کتنی بار دہرایا گیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بار بار کی آرجار نے چوکی کے ایک طرف سوئی ہوئی بوڑھی عورت کو نیند سے بیدار کر دیا۔ اس ضعیفہ نے بڑی وحشت اور پریشانی کے ساتھ سوال کیا کہ تم کو ہوا کیا ہے؟ جوان عورت نے جس کو غم و غصہ کے سبب خود پر قابو نہ تھا جواب دیا: ”کوئی بات نہیں مجھے صرف اس ہی کا ڈر ہے کہ دوبارہ بچوں کو نہیں دیکھ سکوں گی۔ بوڑھی عورت نے سوال کیا کیوں؟ کس لئے؟ جوان عورت بولی کیونکہ زندگی کا بوجھ ڈھونے کی اب مجھ میں طاقت نہیں رہ گئی ہے۔ تم تو اس حقیقت سے واقف ہو کہ میں پہلے کس قدر خوش حال اور آسودہ تھی ساتھ ہی یہ بھی تم سے چھپا ہوا نہیں کہ ان بچوں کا دادا ہر ہر ماہ انہی روپیہ بھیجا کرتا تھا۔ لیکن تین سال ہوئے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ ان تین سالوں کی طویل مدت میں میں نے اپنے گھر کا ساز و سامان، کپڑا لٹا، اور زیب و زینت کے قیمتی اسباب کو بیچ کر اپنے بچوں کی زندگی کے لئے روٹی، ٹکڑے کا انتظام کیا اب میرے پاس بچنے کے واسطے نن کے اس بچے پرانے لباس کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ آج میں ان بچوں کے دادا کے گھر گئی تھی تاکہ اس کے پوتوں کے لئے کچھ طلب کر دوں مگر سوائے گالی گلوچ اور توہین آمیز سلوک کے اور کچھ نہیں ملا۔ تم ہی بتاؤ اب میں کیا

کروں۔ آخری پونجی، نئے سینڈلوں کا ایک جوڑا میرے پاس رہ گیا تھا۔ کل اس کو بیچ کر ایک پرانا سینڈل اپنے لئے خریدا اور بچی ہوئی رقم سے آج رات اور کل دوپہر کے کھانے کا بمشکل تمام بندوبست کر سکی ہوں۔ کل جب میرے بچے اپنے پیٹ کی آگ اس کھانے سے بجھالیں گے پھر میرے لئے ممکن نہیں کہ ان کی روٹی پانی کا انتظام کر سکوں۔ اور اس کی بھی تاب و طاقت اپنے اندر نہیں پاتی کہ ان کو بھوک سے تڑپتا دیکھ سکوں لیکن اگر میں نے اپنے کو ختم کر لیا اور کوئی ان بچوں کے سر پر نہیں رہا تو شاید ان کا داد دنیا کی شرم سے اور اپنی آبرو کی خاطر ان معصوموں کی دیکھ بھال کر لے۔ میں اگر بدرجہ مجبوری اپنے جگر گوشوں کی خاطر خودکشی کر لوں تو خدا کو یہ فعل ناپسند نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرے لئے ممکن ہی نہیں کہ اپنے کلجے کے ٹکڑوں کو بھوک و پیاس سے زمین پر ایڑیاں رگڑتے دیکھ سکوں۔ تم کو بھی میں نے صرف اس لئے بلایا ہے کہ میرے بچے اکیلے نہ رہ جائیں اور صبح میں تم ان کی دیکھ رکھ کر لو۔

بوڑھی عورت نے انکار میں دوڑ پھٹتے ہوئے مادرانہ شفقت اور نصیحت آمیز لہجہ میں کہا ”ایسے خوفناک خیالات کو اپنے دل میں جگہ مست در نہہاری یہ عمر مرنے کی نہیں ہے۔ تم جو ان ہو ساتھ ہی تین بچوں کی ماں اور ایک ہم عمر متمول شوہر کی بیوی، تمہارا اپنا

گھر بار ہے اور ایک خاندان کی عزت تم سے وابستہ ہے۔ اور اس کے جیسے حسب و نسب والا گھرانہ تمہارا والی اور نگہبان ہے۔ جو ان عورت نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ان میں سے کوئی بھی میری اور میرے بچوں کی زندگی میں کام آنے والا نہیں۔ میرا شوہر... وہ کئی سال سے اپنے عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ جب کبھی وہ تہران آتا ہے تو چکر یہاں کا بھی لگا لیتا ہے۔ لیکن بال بچوں کی اس کو ذرہ بھر بھی فکر نہیں ہے۔ تم تو جانتی ہو ان بچوں کو میں نے اپنے ماں باپ کے دیئے قیمتی اثاثہ اور جواہرات کو بیچ کر اب تک پالا پوسا اور بڑا کیا۔ میرے ماں جائے کو میری بدبختی کا ابھی تک علم نہیں ہے۔ اور میں چاہتی بھی نہیں کہ میری اور میرے بچوں کی پرورش کا بوجھ اس کے کندھوں پر پڑے۔ تنہا ایک شخص جو بچوں کی نگہداشت کا خیال رکھتا تھا اس نے بھی تین سال سے پلٹ کر کوئی خبر نہیں لی۔ بلکہ کل میرے دست سوال دراز کرنے پر میرے ساتھ نازیبا رویہ اختیار کیا۔ میرے پاس اب جینے کا کوئی سہارا اور بہانہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ایسی زندگی پر میں موت کو ترجیح دیتی ہوں۔ بوڑھی عورت نے تسلی بھرے لہجہ میں کہا، خدا بڑا کار ساز اور رحیم و کریم ہے۔ اس پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ پھر خود کشی تو بہت بڑا گناہ ہے، حرام ہے۔ جو ان عورت کو ضعیفہ کے طرز گفتگو

سے اندازہ ہو گیا کہ زیادہ بات کو طول دینا بیکار ہے۔ اس لئے خاموشی سے اپنی جگہ جا کر لیٹ گئے۔ بوڑھی عورت بھی مطمئن ہو کر سو گئی کہ اس کی نصیحتوں نے خاطر خواہ اثر کیا۔

لیکن افسوس! ایک گھنٹہ بعد جب سب گہری نیند میں چلے گئے اور ملگجی روشنی والا ٹمٹماتا دیا بھی بجھ گیا تو وہ عورت آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی بچوں کو الوداعی بوسہ دیا۔ اور ان کو ہمیشہ کے لئے جدائی کا داغ دے کر کمرہ سے باہر چلی گئی۔ برآمدہ کے ایک تاریک گوشہ میں جا کر اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیئے اور دعا مانگنے لگی:

”اے خدا لوگ کہتے ہیں تو بڑا ہی انصاف پسند بخشش والا اور مہربان ہے۔ تو یقیناً مجھے معاف کر دے گا کیونکہ تو جانتا ہے کہ میرے اندر نہ اب زندہ رہنے کی سکت باقی رہ گئی ہے اور نہ اس کا یارا کہ مزید ذلتوں کو سہہ سکوں۔ اور نہ ہی ہر روز کی بد بختیوں کو جھیلنے کی میرے اندر طاقت بچی ہے۔ تو ہی ہم سب کا خالق ہے اور تو کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دے گا کہ تیرے نیک و پارسا بندے روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنی پاکیزگی اور عزت نفس کو حریص اور شہوت پسند خود غرض لوگوں کے حوالے کر دیں۔ تیری عدالت، لطف و کرم ستاری اور غفاری اس قدر عظیم اور بے حساب ہے کہ تو یقیناً ایک حقیر اور بد بخت عورت

کو اپنی بارگاہ میں مقبول کر لے گا۔ میں تیری اس مکار اور زہر آلود دنیا اور اس میں بسنے والوں سے بھاگ کر تیری ہی پناہ میں آرہی ہوں۔ اے میرے معبود تو خوب واقف ہے کہ کوئی بھی ماں اپنے بے گناہ معصوم بچوں کو چھوڑ کر ان سے دور نہیں رہ سکتی۔ لیکن غم کے لپکتے شعلوں نے میرے خمن دل کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ اور رنج و غم کا سیلاب میرے تمام احساسات و جذبات کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا ہے۔ میری تمام آرزوئیں اور تمنائیں میرے سینہ میں گھٹ گھٹ کر دم توڑ چکی ہیں۔ لہذا دنیا میں اب میرے لئے کوئی حسن اور کشش باقی نہیں رہ گئی۔ یہ دنیا اور اس کے بارونق ہنگامہ ان لوگوں کو اچھے لگتے ہیں جو اپنے بچوں کو پیٹ بھر کر روٹی کھلا سکتے ہیں اور ان کو بھوک سے تڑپ کر مڑتا ہوا نہیں دیکھتے۔ یہ دنیا ان کے لئے خوبصورت اور دیدہ زیب ہے جو آنسوؤں کے سمندر میں غرق نہیں لیکن میں۔۔۔ جس کے اوپر امید و آرزو کے سارے درتچے بند ہو چکے ہیں اور اس کی ہلکی سی کرن بھی باقی نہیں بچی۔ ایسی دنیا سے مجھے کیا لینا دینا۔ اے دنیا کے خالق اور اس کے پالنہار اب میں سارے رشتے ملاطہ توڑ کر مایوسی کا بوجھ لادے تیری ہی بارگاہ میں آرہی ہوں۔ مجھے ناامید نہ کر بلکہ مقبول کر لے۔ سوائے تیرے در کے میرا اور کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میرے سامنے تیری پُر رحمت درگاہ کے دروازے کھلے ہیں۔

اور میرے پیچھے تاریک، متعفن، فساد آلود دنیا کے مظالم اور بے رحمیوں کے ماسوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اے میرے پروردگار تو مجھ بیماری آفت کی ماری عورت کو اپنی بارگاہ میں مقبول کر لے جس نے اپنی زندگی کے لمحات قناعت کی کوٹھڑی میں گزار دیئے ہیں۔

اس مختصر سی مناجات اور آہ وزاری کے بعد اس نے اپنے رخساروں پر بہتے ہوئے گرم گرم آنسوؤں کو پونچھا، شانوں پر پڑے کبل کو اتارا، چپلوں کو پیروں سے نکالا اور مضبوط قدموں کے ساتھ دروازہ سے نکل کر آنگن میں آئی۔ ایک لمحہ کے بعد ہی پانی میں کسی وزنی چیز کے گرنے کے دھماکے نے فضا میں چھپائی خاموشی کو توڑا اور پھر سکوت چھا گیا۔ دو منٹ بعد کنویں کے پانی کے اندر کسی کے ہاتھ پیر مارنے کی آواز سنائی دی اور پھر موت کا سناٹا پھیل گیا۔ کنویں کے ٹھنڈے اور تاریک پانی کی موجوں نے دست و پا کی آخری کش مکش کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اور اس جوان عورت کو جس کا دل چند لمحوں پہلے زندگی کی حرارت سے دھڑک رہا تھا، جس کی آنکھیں اشکبار اور ہونٹ پھول کی پیشانی کے بوسوں سے معمور تھے اس کو اپنی آغوش میں ہمیشہ کی مسکینی نیند سلا دیا۔

بدنخنہ کا خاتمہ ہوا۔ زندگی کی آنکھ سے ناکامی کا ایک آنسو ٹپکا اور موت کے لبوں کو سیراب کر گیا۔ جگمگ کرتے ستارے

حسب عادت خاموشی سے طنز آمیز نگاہوں کے ساتھ اس روح
 فرسا حادثہ کو دیکھتے رہے۔ وسیع و بیکراں آسمان اپنی پوری تابانیوں
 کے ساتھ، پیشانی پر کسی بل کے بغیر گناہ گار زمین پر سایہ فگن
 تھا۔ مشرقی افق پر شفق پھوٹنے لگی تھی۔ اور آہستہ آہستہ طلوع
 ہوتی صبح کی روشنی میں کوہ البرز کی چوٹی پر جمی ہوئی سفید
 دھلے لٹھے کی مانند برف، اس ناکام لڑکی کی پیشانی کی طرح
 چمک رہی تھی جس کا چہرہ کفن سے ڈھکا افسردہ نظر آ رہا ہو۔
 سویرا پھیل گیا۔ سورج کی روشنی نے تہران کو اپنے گھرے
 میں لے لیا۔ بچے نیند سے بیدار ہو کر ماں کی جستجو کرنے لگے۔ مگر
 عبث۔ مادرانہ شفقت سے معمور اس چہرے کو وہ اب شاید
 خواب ہی میں دیکھ سکیں۔

نوکرانی وحشت زدہ چاروں طرف تلاش کرتی پھر رہی تھی
 ناگہان اس کی نظر آنگن میں پڑے کبل اور چیلوں پر ٹھہر گئی۔ کانپتے
 قدموں کے ساتھ وہ اس جانب بڑھی۔ اس کے پورے جسم پر
 لرزہ طاری تھا۔ وہ کنویں کی سمت گئی اور مستحسب نظروں سے اس
 نے کنویں کے پر سکون پانی پر نظریں دوڑائیں۔ لیکن کنویں کے
 اندر پھیلا اندھیرا دیکھنے میں مانع تھا۔

مگر نہیں۔ ہلکی ہلکی روشنی میں پانی کی سطح پر لہراتے ہوئے
 بال نظر آ رہے تھے۔ ساتھ ہی اڑی ہوئی رنگت والی پیشانی جس

پر رات کے واقعہ کے تاثرات ابھی تک نمایاں تھے ان دو بھولی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دکھائی دیر ہی تھی جواب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ اس کے نیلے ہونٹ پانی کے اندر سے جھانک کر اپنے وجود کا احساس دلارہے تھے۔

ناز و نعمت کی پروردہ یہ لڑکی گیلان کے ایک سردار کی بیٹی تھی۔ جس نے دوسرے سردار (الف) کے گھر میں اور سردار (س) کے زیر سایہ اپنے ماں باپ کی پوری پونجی لٹادی۔ اس کے باوجود کہ وہ متعدد نوکروں کی مالک تھی۔ اس نے اپنی زندگی بڑی کس میرسی کے عالم میں اپنے بچوں اور ایک وفادار بوڑھی خادمہ کے ساتھ ایک ٹوٹے پھوٹے کمرے میں گزار دی۔ اور بالآخر زندگی کی صعوبتوں سے تنگ آکر وہیں موت کو گلے لگالیا۔

لیکن سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ کہ سردار (س) کے ملازموں نے بد بخت عورت کی خودکشی کے بعد سارے شہر میں یہ بات مشہور کر دی کہ بیچاری عورت پاگل ہو گئی تھی اس ہی لئے ایک دن پہلے ہم لوگ اس کے تمام زیورات، جواہرات اور قیمتی اثاثہ کو سیل بند کر کے آئے تھے۔

میرے دوستوں میں سے ایک جو اس پورے قضیہ سے اچھی طرح واقف تھا اس نے نہایت تعجب کے ساتھ اعتراض کیا کہ بالکل غلط۔ دراصل اس آفت کی ماری خانوں نے بھوک کی سختیوں

کی تاب نہ لا کر خودکشی کی ہے۔ یہ قیمتی اثاثہ کے بکس کا قصہ کہاں
سے درمیان میں آگیا۔ اس پر ملازموں نے جواب دیا کہ سردار
(س) کے خاندان کی عزت و آبرو بچانے کے لئے ہم اس طرح کی
باتیں پھیلا رہے ہیں۔

ہاں یہی ہے انسان اور اس کی دنیا کے رسم و رواج۔

لطف علی صورتگر

ڈاکٹر مرزا لطف علی خان صورتگر انیسویں صدی کے اختتام پر (۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۷ء) شیراز میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایران میں حاصل کرنے کے بعد ہائی اسکول ہندوستان سے کیا، اور پھر انگلینڈ چلے گئے ۱۹۰۶ء میں حکومت کی طرف سے انگریزی زبان و ادب کی تحصیل کے لئے آپ کو یورپ بھیجا گیا۔ ایران واپسی پر ایک عرصہ تک یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ دوسری بار ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر ٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لندن گئے وہاں سے کامیاب و کامران لوٹنے پر عہدہ و ادب کی خدمت میں لگ گئے، جس

کے نتیجے میں بہت سی تصانیف وجود میں آئیں۔ یورپی زبانوں سے تراجم کا کام بھی کیا۔

صورتگر شاعر بھی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ”برگہای پراگندہ“ اس بات کا شاہد ہے کہ کلام میں روانی اور زورِ بیان بدرجہ اتم موجود ہے۔ نیز اصول اور قواعد عروضی کے پوری طرح پابند نظر آتے ہیں۔ ان کی نثر ادبی چاشنی کی حامل ہے۔ پرانی قدروں کے ساتھ ساتھ پرانی یادوں کو بھی سینہ سے لگا کر رکھتے ہیں۔ حافظ کی مانند اپنے وطن سے اس قدر محبت ہے کہ اس کے پرسکون فرحت بخش مناظر کو بعض اوقات جنت پر بھی افضلیت دینے سے نہیں چوکتے۔

ان کی کچھ تصانیف اس طرح ہیں:

سخن سنجی، سبک رومان، نظم در انگلستان، تاریخ ادبیات انگلیس، جغرافیائی تاریخی ایران (ترجمہ) اصول علم اقتصاد وغیرہ۔

ایک یادگار دن

ماہ فروردین کی پہلی تاریخ میں ہنوز تین دن باقی تھے۔ ہمارا امتحان ختم ہوئے بھی ابھی ایک ہی دن گزرا تھا۔ خدا کا شکر اس مشکل مرحلہ سے ہم بحسن و خوبی گزر چکے تھے۔ ہر ایک اپنی محنت سے مطمئن تھا۔ وہ کمزور شاگرد بھی مسرور تھے کہ جنہوں نے امتحان سے صرف بیس پچیس دن پہلے ہی تندی سے پڑھنا شروع کیا تھا اور میں بھی خوش تھا کہ جس کو پہلے ہی فرانسیسی ادب کے قطعات ازبر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سب اپنی اپنی خوش و شان دمان تھے۔ اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ امتحان کے خاتمہ پر کچھ سیر و تفریح کی جائے۔

پہلی رات بہار کی سیلابی بارش نے باغوں میں پھولوں کو دھو کر شگفتہ بنا دیا تھا۔ پہاڑ کی پشت سے آسمان کے سنہری گریبان سے جھانکتا ہوا سورج

ماہ اولین روزی کہ بخاطر دارم“ دکتر لطف علی صورتگر، دریای گوہر جلد اول چاپ ہشتم، مہدی حمیدی ص ۸۲

ہماری معصوم جوانی پر مسکرا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے آسمان کھلا پڑ رہا ہو۔ ہنسنے کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ تند و مند و بلند و بالا درختوں کے اطراف پر ندے چھپاتے ہوئے رقص و سرود میں مست تھے۔ پیلی چونچ والی ایک چھوٹی سی گوریاز چڑیا، گھاس پر بیٹھی ہوئی شبنم سے آلودہ اپنے پروں کو دھوپ کی شعاعوں تلے جھاڑتے ہوئے اپنے جوڑے کو بلاری تھی۔ ایک دیہاتی لڑکا سال اوڑھے، اپنے کاندھے پر ایک لمبی سی لکڑی ٹکائے اپنی بھیتروں کے گلہ کو پہاڑ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس کے مہندی سے رچے ہاتھ اس بات کے شاہد تھے کہ وہ بھی بہار کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

وہ لڑکا زیر لب گنگناتا ہوا قریب سے گذرا اور ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا جیسے نظروں نظروں میں ہمیں بہار کی آمد پر مبارکباد دے رہا ہو۔ ہمارے ایک دوست نے جو اپنی بزلہ سنجی اور خوش مزاجی کے لئے مشہور تھے اس کی سکرابٹ سے حوصلہ پا کر اسے بلایا اور اس کا نام پوچھا۔ وہ بیچارہ دیہاتی بچہ جس نے کبھی کسی شہری بابو سے بات نہیں کی تھی ایک دم گھبرا گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک لہرائی اور لگا جیسے وہ جملہ جو کبھی ایسے موقعوں پر اس کے والد بولا کرتے تھے، اسے یاد آ گیا ہو۔ اس نے مخصوص لحن کے ساتھ جواب دیا۔ آپ کے غلام کو حسین کہتے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے گفتگو کو طول دیتے ہوئے کہا، تم نے عید نوروز کے لئے کیا کیا تیاریاں کی ہیں؟

اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میرے والد نے

میرے لئے ایک نیا جوتا خریدا ہے۔ اور کل شہر سے واپسی پر میرے لئے وہ وہ ایک ٹوپی بھی لے آئے جو ابھی تک کاغذ میں لپیٹی کمرے کے ایک کونہ میں رکھی ہوئی ہے۔ اور میری خوبصورت ہری قبا ابھی تو نہیں سلی لیکن اماں کا کہنا ہے صبح تک تیار ہو جائے گی۔

سب سے زیادہ میں بچے کی معصومیت سے متاثر ہوا۔ اور دوستوں کی مرضی سے بچے کو مٹھانی کھانے کے لئے دی۔ لڑکے نے بڑے احترام اور ادب کے ساتھ اس کو لے لیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ اس کی بھڑوں کا گلہ بہت آگے نکل گیا ہے تو اس نے عجلت کے ساتھ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے اور مٹھی بھر کر کش مکش نکال کر ہم لوگوں کو دی۔ اس ہدیہ کے ساتھ معذرت وغیرہ جیسے رسمی الفاظ ادا نہیں کئے۔ بلکہ صرف اس کی بڑی بڑی سیاہ پلکوں والی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس ناچیز تحفہ کو پیش کرنے پر شرمندہ ہے۔

باغ میں سیب کے ایک چھتنا درخت کے نیچے ہم نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر خوش گپی کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہر طالب علم کے ذہن میں کیا آرزو اور تمنا تھی وہ اس کو بیان کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے ساتھی کا مشورہ بھی طلب کرتا جاتا تھا۔ ہم میں سب سے کم سن بڑی بڑی آنکھوں والا ایک لڑکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے آباہی کے دفتر میں کام کرے۔

اپنے اس خیال کو عملی روپ دینے کے لئے اس نے اپنے ذہن میں کچھ پروگرام بھی مرتب کر رکھا تھا۔

سب سے زیادہ میں ہی خیالی پلاؤ پکانے میں مگن تھا اور نوکری کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنی زندگی شعرو شاعری اور ادب کی خدمت کرنے میں بسر کروں۔ اور علمی شہرت کے ساتھ ساتھ جو کچھ تھوڑے بہت پیسہ حاصل ہوں اس سے زندگی کی گاڑی چلاؤں ان دونوں میں فردوسی کے اشعار پر تک بندی کیا کرتا تھا جن کو سن کر ہمارے دوست ہنسا کرتے تھے۔ میری اس آرزو پر بہت دن تک دوست احباب جملے کسائیے کوئی کہتا ٹھیک ہے تم باصلاحیت ہو۔ ادبی ذوق و شوق رکھتے ہو اور ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ تمہیں شہرت و مقبولیت حاصل ہو جائے لیکن یہ مشغلہ مادی زندگی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ حافظ ہی کو دیکھو خود تنگ ہونے کے باوجود صرف زبانی جمع خرچ سے محبوب کے سیاہ تل پر سمرقند و بخارا نچا کر کیا کرتا تھا۔

دوسرے ساتھی نے اس سے بھی زیادہ پر مذاق پھبتی کسی۔ یہ بہت اچھا ہے کہ تم صاحب ذوق ہو۔ جب میں بادشاہ بن جاؤں گا تو تمہیں اپنے دربار میں ملک الشعراء بنادوں گا۔

تیسرے نے چہک کر کہا جناب شاعر صاحب آپ مہربانی کر کے امیر معزی کے اشعار کے وزن پر ہمارے جوتوں کی تعریف میں فی البدیہہ قصیدہ کہہ دیں تو ہم جانیں آپ کتنے پانی میں ہیں۔

میں نے اس جملہ بازی سے تنگ آکر، چالاکی کے ساتھ کہا: بھی میرے بارے میں سب سے آخر میں گفتگو کی جائے۔ پہلے دوسروں کی سنیں تو بہتر ہے۔

میرے ایک ہر دل عزیز، خوش اخلاق دوست نے ہنستے ہوئے کہا
بھئی میں بہت کم پیسہ لے کر اس شرط پر تجارت کرنا چاہتا ہوں کہ جب
بھی ہمارے کسی دوست کو کوئی چیز خریدنی ہو تو وہ میری ہی دکان سے
خریدے۔

الغرض سب نے اپنے اپنے مستقبل کا زبانی نقشہ کھینچا۔ یہاں تک کہ ہمارے
ایک حسن دوست کی باری آ پہنچی۔ اس نے تجربہ کارانہ لب و لہجہ کے ساتھ
نصیحت آمیز انداز میں کہا۔

دوستو! زندگی حادثوں اور اتفاقات کا شکار ہے۔ ہم مختلف ادوار
اور حالات سے گزریں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں گی۔
نہیں معلوم ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے اور قسمت کون سا گل کھلاتی ہے۔
آج ہمیں اس بات کا عہد کرنا ہے کہ ہم میں سے جس کو بھی پہلے توکری
مل جائے وہ دوسرے کی مدد کرے اور اپنی اس دوستی اور عہد کو ہم
اس طرح نبھائیں کہ دنیا میں مثال قائم ہو جائے۔

دوستوں نے باہم مشورہ کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اس عہد و پیمان کا خاکہ
ہمارے وہ دوست تیار کریں گے جن کے پاس علمی اور ادبی سوچ بوجھ ہے۔
اور یہ کام میرے ذمہ کر دیا گیا۔ میں نے درخت سے سید کا ایک پھول توڑ
کر اپنے پانچوں دوستوں کو بلایا اور کہا اس قرارداد اور عہد کا اقرار
کرنے کے بعد ہم میں سے ہر ایک اس کی ایک پتی توڑ کر اپنے ساتھ لے
جائے گا اور ضمانت کے بطور اس کو اپنی کتاب کے صفحوں کے درمیان حفاظت
سے رکھ دے گا۔

میرے دوست پھول کی طرف جھکے اور اس کی پنکھڑیاں توڑنے سے پہلے میں نے ان کلمات کے ساتھ ان سے حلف لیا :

”بہار کے اس معصوم قاصد کی پاکی کی قسم اور اس خوبصورت باغ کی مرمریں دوشیزہ کی سوگند ہم ہر دور میں اور ہر طرح کے حالات میں ان پنکھڑیوں کی مانند ایک دوسرے سے ملے رہیں گے۔ اور اگر ایک دوسرے سے جدا بھی ہو جائیں تو محبت کا ناٹھ اس ہی استحکام کے ساتھ دلوں کے اندر استوار رہے گا جب اس سفید پھول کے مانند ہمارے بال سفید ہو جائیں گے تب بھی ہم اپنی دوستی نبھاتے رہیں گے۔“

اس کے بعد پانچ ہاتھوں کی انگلیوں نے بڑھ کر اس پھول سے ایک ایک پنکھڑی نوچ کر اپنی کتاب میں رکھ لی ہم میں سے سب سے کم عمر دوست کا ہاتھ پھول کی پتی توڑتے وقت کانپ رہا تھا۔

جب ہم ایک دوسرے سے خدا حافظ کہہ کر اپنی اپنی راہوں پر روانہ ہوئے اور ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ تو میں نے اپنے کم سن دوست سے اس کپکپی کی وجہ دریافت کی۔ اس نے بے اختیار ہو کر کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم لیکن میرا دل اندر سے گواہی دے رہا ہے کہ اپنے دوستوں کے بیچ میں ہی سب سے پہلے اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔“

وہ بیچارہ لڑکا اس دن کے دوہی سال بعد چیچک کا شکار ہو کر اصفہان میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اپنی ساری نیکیاں اور خوشیاں اس نے مالک ازل کے حوالے کر دیں۔

اب تک میں دوبار اصفہان جا چکا ہوں۔ اور جب بھی گیا اس کی قبر پر جا کر میں نے عقیدت کے پھولوں کے ساتھ آنسوؤں کے موتی بھی بچھا رکھے ہیں۔ ہمارے شہر والوں کی عادت ہے کہ وہ جب بھی

کسی کی قبر پر فاتحہ کے لئے جاتے ہیں تو کھرنی سے ایک ستارہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنے دوست کی قبر پر سیب کا پھول بنایا ہے اور نذرانہ عقیدت کے طور پر پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کیا ہے۔ لیکن افسوس سیب کا جو پھول اس کی قبر پر میں نے بنایا اس کی صرف چار پنکھڑیاں تھیں اور ایک پنکھڑی کی جگہ میں نے خالی رکھی تھی۔ مجھے نہیں معلوم دوسرے لوگ ہمارے اس عہد و پیمان سے کیا نتیجہ اخذ کریں۔ لیکن میں سوچتا ہوں وہ کون سا دن ہوگا جب ہم میں سے کسی کی قبر پر تین پنکھڑیوں والا پھول بنے گا۔ اور آخر میں ہم میں سے کون ہوگا کہ جس کی قبر بغیر کسی پھول کے رہ جائے گی۔

LIBRARY

ADDITIONAL-LIBRARY-E-URDU

no 34, 259

16/7/16

شش پر تو

ڈاکٹر علی شیراز پور پر تو، فارسی ادبی حلقوں میں شش پر تو کے قلمی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ بڑی عجیب اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی کے بارے میں اطلاعات برائے نام ملتی ہیں۔ جیسا کہ ان کی تصانیف کے سنہ تالیف سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا زمانہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے درمیانی دور کا احاطہ کرتا ہے۔ ایران کے انقلاب اسلامی کے رونما ہونے کے تقریباً دو تین سال بعد آپ نے اس دنیا سے رخصت لی۔

علی پور پر تو شیرازی میں پیدا ہوئے اور اس ہی مناسبت سے

اپنا قلمی نام شیرازہ پر تو یعنی شش، پر تو انتخاب کیا۔

۶۰-۱۹۵۷ء دہلی میں سفارتخانہ ایران سے وابستہ رہے، یہ وہی زمانہ ہے جب مشہور دانشور علی اصغر حکمت ایران کے سفیر کی حیثیت سے دہلی میں مقیم رہے۔

شش، پر تو کا نام جدید فارسی نثر نگاروں کی فہرست میں لیا جاتا ہے۔ ان کی تحریر میں شگفتگی اور شعریت کی چاشنی موجود ہے۔ اکثر ہی تاریخی واقعات کو طرزِ بیان کی خوبی اور فنکارانہ چابکدستی سے نیم افسانوی سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔

انسانی فطرت کی نمائندگی کا ہنسران کو اچھی طرح آتا ہے۔ جذبول کی تپش، احساس کی چھین اور نہ صرف عشق کی کسک بلکہ اس کا اظہار بھی ان کے یہاں موجود ہے۔

افسانہ نویس اور خوش طبع شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ پر تو محقق اور ماہر لسانیات بھی ہیں۔ دہلی میں سرکاری ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران وہ ایک ایسی لغت تیار کرنے میں لگے تھے جس میں بتایا جا رہا تھا کہ دنیا کی سات آٹھ زبانیں ایسی ہیں جن کے الفاظ و کلمات میں فارسی مماثلت پائی جاتی ہے۔

شش، پر تو ایک مرخا مرخ، دوست نواز شخصیت تھے۔ ان کی نثر شعریت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا اپنا ایک لوچ اور شگفتگی ہے، جوتاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کا افسانہ ادہم پنیہ روز

ان کی اس خصوصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔
 ان کی تصانیف میں سے کچھ اس طرح ہیں :
 پہلوان زند، کام شیر، ویدا، ہفت چہرہ اور داستانہا
 وغیرہ

ادہم موچی

بلخ کے بازار میں بلا کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ راہ گیروں کی آمد و رفت زوروں پر تھی۔ دکاندار چلا چلا کر اپنے مال کا دام لگا رہے تھے۔ مزدوروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ نیچے پانی کے لئے سقہ کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ فضا میں چھائے گر دو غبار سے بے نیاز لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔

الغرض سب اپنے اپنے کاموں میں مگن یہاں تک کہ ادہم موچی بھی بازار کے ہنگاموں سے دور، ہاتھ میں ایک سوا لیئے پرانی جوتیوں کی مرمت کرنے میں لگا تھا۔ ادہم اگرچہ ایک غریب موچی تھا لیکن اللہ تعالیٰ

نے اس کو تین بڑی خوبیوں سے نوازا تھا۔ نکھرتی جوانی، مردانہ وجاہت اور اوپر سے صاف کھلا دل جو ہمیشہ مطمئن اور مسرور رہتا۔

اچانک بازار میں ایک شور مچا ہوا۔ رفتہ رفتہ اس میں تیزی آئی اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ لوگ سڑکوں اور دکانوں پر ایک طرف کو سمٹ گئے۔ آخر یہ سب کے سب ایک ہی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں یہ معلوم کرنے کے لئے ادہم اپنی دکان کے آگے کھڑا ہو گیا۔ دور سے ایک زرنگار تخت حرکت کرتا نظر آیا جس کو اعلیٰ نسل کے چار گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اس تخت کے اوپر قیمتی جواہرات سے مرصع ایک کلس اپنی جگمگاہٹ سے نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ دائیں بائیں نوکر چاکر، گلرو خوش اندام کنیزیں گھوڑوں پہ سوار تخت کے ہمراہ چل رہی تھیں۔ اس ہی پر شکوہ جلوس کی بدولت بازار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ تخت، خرام ناز کے ساتھ رواں تھا۔ ادہم موچی پر شوق حیران نظروں سے اسے تک رہا تھا۔ جیسے عماری اس کی دکان کے سامنے پہنچی، کسی کی خوبصورت مخروطی انگلیوں نے آسمانی رنگ کے حریری پردہ کو تھوڑا سا کھسکایا اور ایک دوشیزہ کی بھلک دکھائی دی۔

اس کا چہرہ آفتاب کی مانند روشن تھا۔ نہ جانے کیسے ان دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور ان کی آن میں کیوڈ کا تیرا پنا کام دکھا گیا۔ تخت کیونکہ آگے کی سمت بڑھتا جا رہا تھا۔ دوشیزہ نے بھی بددلی سے پردہ کا کونہ گرا دیا۔

ادہم کے دل میں اس لڑکی کے نقش و نگار اتر گئے تھے اور عشق کا جادو اپنا پورا اثر دکھا چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پٹریاں جمی تھیں اور معلوم ہوتا تھا زندگی میں پہلی بار کسی کی نگاہ ناز سے

گھائل ہوا ہے۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے لب ہلائے اور اپنی دکان کے سامنے سے گزرنے والے ایک راہ گیر سے پوچھا وہ کون تھی؟
جواب ملا یہ لڑکی بادشاہ کی بیٹی ہے جو سیر و تفریح کے لئے باغ کی طرف جا رہی ہے۔

ادیم کا دل اس کے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ بالکل چڑیا کے اس بچہ کی مانند جس نے ابھی ابھی اڑنا سیکھا ہو۔ راستہ سے ناواقف، ایسا گیا کہ پھر نہ پلٹا۔

اپنے چھوٹے سے جھونپڑے میں ادیم ساری رات جاگتا رہا۔ چمڑا، جوتے بنانے کے اوزار، لٹنی ٹپھونی چلیں، یہ سب سامان کو ٹھہری میں بکھرا پڑا تھا۔ دراصل جلدی کا تقاضہ کرنے والے گاہکوں کا کام وہ رات میں بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ تاکہ صبح ہوتے ہی ان کے حوالے کر دے۔ لیکن اس رات نہ کام کرنے میں اس کا دل لگا اور نہ آنکھ پل بھر کو جھپک سکی۔ وہ سوچتا رہا عاشق ہونے کے لئے کیا بادشاہ ہی لڑکی رہ گئی تھی۔ جس سے دل کی بات بھی نہیں کہی جاسکتی۔

اسے خیال آیا بدبخت لوگ ہمیشہ بدبخت ہی رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ عشق میں بھی بدبختی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور وہ محبت میں ناکام و نامراد اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ کیوں حالات نے ایسی لڑکی کے عشق میں گرفتار کر دیا جس کو دوبارہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔

سوائے خواب کے اور نیند بھی نہیں آتی۔

سویرے کے قریب اس نے زمین پر اپنا سر ٹکایا اور چہرہ خاک پر رگڑنے لگا۔ پھر آنسو بھری آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کی:

اے خداوند کریم، لاچاروں کے مددگار، بے نواؤں کے حامی، اگر میری قسمت میں دوبارہ اپنے محبوب کو دیکھنا نہیں لکھا ہے تو مجھے موت دے دے۔ ایک عاشق نامراد کے لئے ایسی زندگی سے موت کہیں بہتر ہے جس میں محبوب کا دیدار بھی میسر نہ ہو۔

اس لڑکی کا نام ریگاکھا تھا۔ ریگاباغ کی سیر سے جلد ہی اپنے محل واپس آگئی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں جا کر کمرے کا دروازہ بند کر لینا چاہتی تھی تاکہ کوئی اس کی اڑی اڑی رنگت نہ دیکھ پائے اور تیزی سے دھڑکنے والے دل کی تپش محسوس نہ کر سکے۔

اس شہزادی کے لئے یہ بات کیسی عجیب و غریب تھی کہ پلک جھپکتے وہ ایک اجنبی موچی کی پُر شوق آتشیں آنکھوں کا شکار ہو گئی اور اس کو اپنے اوپر اختیار نہ رہا۔ اپنے دل کا راز اب کس سے بیان کرے۔ کون دل جوئی کرے؟ کوئی نہیں جو اس کے درد کا علاج کر سکے۔

اگر یہ خوبصورت نوجوان موچی کسی وزیر یا امیر کی اولاد ہوتا یا پھر کسی ملک التجار ہی کا بیٹا ہوتا، تو بھی ممکن تھا کہ وہ کسی کے ذریعہ اپنے باپ کو شادی پر آمادہ کرتی۔ مگر اب اس کے لئے ممکن نہیں تھا کہ اپنے دل کا راز بھی کسی پر ظاہر کر سکے۔

اس کے بعد ریگا کسی رات سو نہیں سکی زندگی سے دل اچاٹ ہو گیا۔
کھانے پینے سے رغبت جاتی رہی۔ اور دن بدن کمزور و لاغر ہوتی چلی
گئی۔

کام میں مصروفیت کے دوران ادہم کو اوزاروں میں بھی ریگا کے
ہی کی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ شام کو جلدی ہی اپنی دکان بند کر کے
بادشاہ کے محل کی طرف نکل جاتا۔ قصر کے در و دیوار پر یوں نظریں
گاڑ دیتا جیسے محل کی فصیلوں کو پھاڑ کر ریگا کو دیکھ لے گا۔

ایک دن محل سے ماتم اور آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوئیں۔
تمام شہر نے سوگ کا لباس پہن لیا۔ بادشاہ کی بیٹی ریگا کا انتقال
ہو گیا تھا۔

ریگا کے جنازہ کو بڑے اہتمام اور شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ
اٹھایا گیا۔ تمام مذہبی رسومات ادا ہوئے۔ سفید ریشمی کفن میں ملبوس
اس کے حسین و نازک جسم کو ایک تابوت میں مقید کر کے قبر میں
اتار دیا گیا۔

نہ تنہا ادہم بلکہ تمام شہر اس کی جوان موت پر رورہا تھا۔ اور
کف تأسف ملتا تھا:

”حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے“

ادہم کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ بھڑ بھڑ سے
دور، ایک طرف سینہ کو بی میں مصروف تھا، تمام فضا اس کی آہ وزاری

کے نالوں سے گونج رہی تھی۔

ریگا کو دوبارہ دیکھنے کی موہوم سی امید بھی بیچارے ادہم کے دل میں دم توڑ گئی۔ اگر وہ زندہ رہ جاتی تو شاید کبھی اس کے دیدار کی پیاس بجھ جاتی۔ لیکن اب وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے محو خواب ہے۔ اس نے چاہا اپنی آرزو کے ساتھ خود کو بھی خاک میں ملا دے۔ محبوب کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد جینے سے کیا حاصل؟ اشتیاق دید کی حسرت آگ کی مانند اس کے دل میں بھرپک رہی تھی جتنا بھی وہ آنسو بہاتا سکون ملنے کی بجائے آتش شوق تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

رات ہو چلی تھی اور لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ لیکن ادہم اس جنگل بیابان میں بھٹک رہا تھا جیسے عشق اس کو اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ اچانک ادہم نے اپنے آپ کو ریگا کی قبر پر کھڑے پایا۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ اچھا تو یہی ہے کہ روتے روتے یہیں اپنی جان دے دوں۔ وہ اپنے چہرے کو ریگا کی قبر پر رگڑ رہا تھا کبھی اس کو بوسہ دیتا تو کبھی آنکھوں سے چومتا اور بے اختیار عاشقانہ کلمات اس کی زبان سے نکل رہے تھے۔

امید و بیم کی حالت میں ایک دفعہ اس نے سوچا کہ میں زندگی سے تو بیزار ہو ہی چکا ہوں اور محبوب کی آخری آرا مگاہ پر دم توڑنے کی خواہش ہے۔ لیکن معشوق کو ایک بار دیکھے بغیر بھی اس دنیا سے

جانے کو دل نہیں چاہتا۔ کیوں نہ قبر کو کھود ڈالوں اور تنہائی میں
بلا کسی خوف و خطر کے اس کے دیدار کی پیاس کو بجھا کر ہمیشہ کے
لئے اس کے پہلو میں سو جاؤں۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے قبر کی مٹی کو کھودنا شروع
کر دیا۔ ادم کے جسم کی پوری توانائی اس کے ہاتھوں میں سمٹ
آئی تھی۔ ایک غیر مرنی طاقت کے ساتھ وہ تیزی سے مٹی
نویچ نویچ کر پھینک رہا تھا۔ فضا مکمل خاموش تھی یہاں تک
کہ ہوائے چلنے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک
عجیب ویرانی اور وحشت کا ماحول چھایا ہوا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں قبر کا منہ کھل گیا اور جب ادم کے ہاتھ
تابوت سے ٹکرائے تو خوشی اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے ادم
کا دل بلیوں — اچھلنے لگا۔

اگلے ہی لمحہ تیزی کے ساتھ اس نے تابوت کا ڈھکن اٹھایا
اور رینگا کے خوبصورت چہرے پر پڑے کپڑے کو کھینچ لیا۔

تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ، تاریکی کو چیرتی ہوئی اس
کی نگاہیں فرشتہ کی طرح معصوم اڑی اڑی زینکت والی — لمبی
کو دیکھ رہی تھیں۔ بیقرار ہو کر اس نے اپنا چہرہ رینگا کے رخساروں
پر رکھ دیا اور اس کے ہونٹوں کا بوسہ لینے لگا۔

خدا کی قدرت دیکھئے، رینگا کا منہ گرم تھا اور اس کے نسیم وا

ہو نمٹوں سے زندگی کی بو آ رہی تھی۔ خوشی کے مارے ادہم کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ ریگا کے ہاتھوں کو تابوت سے باہر نکال کر اس کی نبض پر ہاتھ رکھا وہاں زلیست کی حرارت باقی تھی۔ ادہم نے بے دھڑک اس نازنین کو باہر نکالا۔ اپنا لباس اتار کر اس کو پہنایا، سفید کفن کے ٹکڑے سے اس کا سر ڈھانکا اور قبر کو پہلے کی مانند برابر کر کے جلدی سے ریگا کو اپنے گھر لے گیا۔

اپنی کوٹھری میں ریگا کو لٹا کر اس کے چہرے پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ پھر اس کے داہنے ہاتھ کو کس کر باندھا اور ہاتھ کی رگ کو کاٹ ڈالا۔ خون باہر بہنے لگا۔

تھوڑا سا خون جانے کے بعد ریگا کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور خود کو ایک لڑکی کی طرح جوتیوں اور پرانے فرموں سے بھرے کمرے میں پڑا پایا جہاں نوجوان ادہم پہلو میں بیٹھا اس کا ہاتھ تھامے پر شوق مسرت بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ریگانے وحشت زدہ ہو کر اٹھنا چاہا۔ ادہم نے اس کے بازو میں بندھے بند کو کاٹ کر ہاتھ کو آزاد کر دیا۔ اور اس کے بعد خدا کے حضور سجدہ شکر بجالایا۔

ریگا کو ادہم کا چہرہ جانا پہچانا لگا۔ پوچھا تم کون ہو؟

ادہم نے جواب دیا:

میں ایک غریب موچی ہوں اور میرا نام ادہم ہے۔ اس کے بعد پورا واقعہ من وعن اس کے سامنے بیان کر دیا۔

ریگا اٹھ کر بیٹھ گئی محبت اور احسان مندی کی نگاہوں سے ادہم کو دیکھا اور مستحی مسکراہٹ کے ساتھ ہولے سے ادہم کا ہاتھ تھام لیا اور کہا:

اے نوجوان! خدا نے تمہارے لئے ہی مجھے دوبارہ زندگی دی ہے۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔

اگلے دن ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔ خوبصورت ریگا ادہم کے گھر میں رہنے لگی۔ ان کی شادی کو دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ خدا نے انہیں چاند سا بیٹا عطا کر دیا۔

اس لڑکے کی قسمت میں ایک دن مشہور آدمی بننا لکھا تھا۔ اسی لوگوں نے بچے کا نام ابراہیم رکھا۔

چند سال گزر جانے کے بعد لوگ ریگا کی موت کو بھول گئے۔ ایک دن ریگا کی ماں شہر کے حمام میں گئی ہوئی تھی۔ ایک تین سال کا خوبصورت معصوم سا بچہ کھیلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ جب بادشاہ کی بیوی کی نظر اس بچے پر پڑی تو اس کو اپنی بیٹی ریگا کی شباہت بہت زیادہ نظر آئی۔ بچے کو گودی میں لے لیا اور پیار کرتے ہوئے اپنی جوان بیٹی کی یاد میں آنسو بہانے لگی۔

شاہ بانو نے بچے کو اپنا بیٹا بنانے کی آرزو میں کینزروں کو حکم دیا جہاں سے بھی ہو اس کی ماں کو ڈھونڈ نکالیں۔ کینزریں جب ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہاں تک پہنچیں تو انہوں نے ریگا کو پہچان لیا۔ یہی ”ابراہیم ادہم“ ایک مدت گزر جانے کے بعد اپنے نانا کی جگہ بلخ کے تخت پر بیٹھے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ بادشاہت چھوڑ چھاڑ کر درویشوں کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ ابراہیم ادہم بڑے متقی اور پرہیزگار لوگوں میں سے تھے۔ اور آج بھی ان کا سلسلہ ادہمیہ کے نام سے مشہور ہے۔

صادق چوبک

صادق چوبک، فرزند اسماعیل - ماجر بوشہری - ۹۱۶ء / ۱۲۹۵ء ش ایران کے شہر بوشہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بوشہر در شیراز میں حائس کی اور خرید تعلیم کے لئے تہران کے امریکن کالج کا انتخاب کیا۔

جدید افسانہ نگاری کی دنیا میں صادق ہدایت کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا۔ ۹۴۵ء / ۱۳۲۴ء ش میں خیمہ شب بازی کے افسانوی مجموعہ کا تحفہ لے کر ادبیات کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اس اولین مجموعہ کو ادبی حلقوں میں سراہا گیا، اور فارسی افسانہ نویسوں کی صفِ اول میں ان کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔

آسان فہم روزمرہ زبان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ انسانی
 احساسات و جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کا تعلق
 عام طور سے غریب اور پسماندہ طبقوں سے ہوتا ہے۔ اس طبقہ کی افلاس
 زدہ جاہلانہ، محنت و مشقت والی زندگی کو فنی مہارت کے ساتھ یوں پیش
 کیا ہے گویا وہیں سانس لیتے رہے ہوں۔ جدید فارسی ادب میں اس
 کی مثال خال خال ہی نظر آتی ہے۔

چوبک کی کچھ تصانیف اس طرح ہیں :
 انتری کہ لوطیش مردہ بود (تنگسیر زناول) سنگ صبور (ناول) توپ
 لاسٹیکی (ڈرامہ) درس زمین عجائب (ترجمہ) وغیرہ۔

یہ بھی

گیارہ سالہ بھئی کے دماغ میں ایک دن یہ بات آئی، کیوں نہ وہ بھی "ڈیلی نیوز" اخبار بیچا کرے۔ اس نے "ڈیلی نیوز" آفس کی راہ لی اخبار کے دفتر میں متعلقہ کلرک اور روزانہ اخبار بیچنے والے اس کے ہم سن و ہم سال بچوں نے بھی کوکھی بار اخبار کا نام اور اس کا صحیح تلفظ یاد کرایا۔ اس نے بھی اچھی طرح رٹ لیا۔ معصوم بچے کے ذہن میں اخبار کا نام

”دیزی“ کی شکل میں محفوظ رہ گیا۔

یحییٰ نے کئی بار اس نام کو اپنے ذہن میں دہرایا، ڈیلی نیوز، ڈیلی نیوز اور اخبار کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

گلی میں پہنچ کر اس نے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے ڈیلی نیوز کی آواز لگا کر اخبار بیچنا شروع کر دیا۔ اس کو کسی سے کوئی مطلب نہ تھا وہ تو بس خوش خوش اپنے کام میں مست تھا۔ لوگوں کے اخبار خریدنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی مسرت بھی بڑھتی جاتی تھی۔

اخبار کی چند کاپیاں بیچنے تک تو یحییٰ کو اس کا نام یاد رہا۔ مگر کرنی دیکھئے۔ جب وہ ایک صاحب کے بقایا پیسہ واپس کر رہا تھا تو اس میں چند سکوں کی کمی پڑ رہی تھی۔ ان صاحب نے بھی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ سکے بچے کو بخش دیئے۔ بس اس ہی ادل بدل میں اخبار کا نام اس کے ذہن سے نکل گیا۔ اب لاکھ یاد کرتا ہے مگر لا حاصل۔

بچہ ڈر گیا۔ اور حیران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خاموشی سے سڑک پر چکر لگانے لگا۔ اس بیچ بھی کچھ لوگوں نے اس سے اخبار خریدا۔ یحییٰ اخبار خریدنے والوں کا منہ اس امید پر بھڑبھڑاتا رہا۔

۱۔ ایک مخصوص قسم کا کھانا پکانے والی مٹی کی ہانڈی کو ایران میں ”دیزی“ کہتے ہیں۔ بچہ اپنی جہالت کے سبب صوتی مناسبت سے اس کے ہم شبیہ اخبار کے نام کو یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

تھا شاید ان کے منہ سے اخبار کا نام سن سکے لیکن وہ لوگ خاموشی اور لاپرواہی سے اس کی طرح نگاہ ڈالے بغیر اخبار لے کر چلے جاتے۔
 بیچارہ اداس و پریشان اپنے آس پاس دیکھ رہا تھا کہ اگر اپنے ساتھی بچوں میں سے کوئی نظر پڑ جائے تو ان سے اخبار کا نام معلوم کر لے۔
 کئی بار اس کے سامنے ”دیزی“ کی شکل لہرائی لیکن اس کو کچھ یاد نہ آیا۔ یہاں تک کہ ”دیزی“ کی ایک بسی قطار اس کی آنکھوں کے آگے رقص کرنے لگی۔ اس مناسبت سے اچانک اس کے ذہن میں اخبار کا نام بجلی کی مانند کوندا مگر زبان پر آتے آتے پھر اس کے ذہن سے نکل گیا۔

وہ سر لٹکائے دھیرے دھیرے راستہ پر چلا جا رہا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں نام بھول جانے کے جسم میں اخبار اس سے چھین نہ لیں۔ بندل کو کس کر بغل میں دبائے تھا۔ اس نے رونا چاہا مگر آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے۔ شرم اور ڈر کے مارے راہ گیروں سے بھی وہ اخبار کا نام نہیں پوچھ سکا۔

ایک ایک اس کے چہرے پر ایک چمک آئی جیسے کچھ یاد آ گیا ہو، ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

تیزی سے سڑک پر دوڑتے ہوئے چلانے لگا۔ پریوس پریوس۔
 آخر اخبار کا نام مل ہی گیا۔

۱۔ ایک عام قسم کے اسٹو کو ایران میں ”پریوس“ کہتے ہیں۔ چونکہ ڈیلی نیوز اور پریوس میں صوتی مشابہت پائی جاتی ہے۔ لہذا کبھی اخبار کا نام ”پریوس“ سمجھ بیٹھا۔

یوسف اعتصام الملک آشتیانی

یوسف اعتصام الملک آشتیانی کا شمار ایران کے معاصر ادباء میں کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواسط ۱۸۵۶ء/۱۲۵۳ ش تبریز جیسے علمی گہوارہ میں آپ نے جنم لیا۔ آپ کی پوری تعلیم تبریز میں ہوئی۔ اسلا مبولی ترکی کے خوش بیان خطیب فرانسیسی زبان کے توانا مترجم اور عربی زبان کے مہارت میں نہ صرف ایران بلکہ مصر و عراق اور شام میں آپ کا طوطی بولتا تھا۔ غضب کے خطاط تھے۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علمی و ادبی سرگرمیوں اور تصنیف و تالیف میں گزارا۔ وقت کی دکھتی رگ پر بڑی فنکارانہ مہارت سے ہاتھ رکھتے ہیں۔ ”کبوتر و کلاغ“ کی داستان ایک روشن مثال ہے۔

جوانی ہی میں تبریز سے تہران آ گئے تھے۔ اور یہیں عمر کی ترسٹھ نرم و
گرم منزلیں سر کرنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔

ان کی تصانیف جن میں تراجم بھی شامل ہیں چند اس طرح ہیں:
قلائد الادب فی شرح الطواق الذہب، ثورۃ الہند، تربیت نسوان
مجلہ بہار (درد و دورہ) تیرہ بختان (ترجمہ) خدعہ و عشق (ترجمہ)
سیاحتنامہ فیثا غورس، سفینہ غواصیہ، فہرست کتاب خانہ مجلس (درد و جلد)
اس کے علاوہ اور بہت سے تراجم جو زیر طبع سے آراستہ نہ ہو سکے۔

”کبوتر اور کوّا“

کوّا: میرے دوست میں دیکھتا ہوں کہ عذاب میں مبتلا
 بے قرار روحوں کی مانند تم کو بھی سکون و آرام نہیں ہے۔ ہر وقت
 ایک اضطرابی اور سیمانی کیفیت۔ کسی وقت سل سے بیٹھنا نہیں۔
 آخر اس بے اطمینانی اور تلاش و جستجو کا سبب کیا ہے؟
 کبوتر: دنیا میں تل کے برابر بھی کوئی جگہ ایسی باقی نہیں جہاں
 کوئی دو گھڑی کے لئے بھی راحت و سکون سے بیٹھ سکے۔ سارے
 جہاں میں تلواروں کی جھنکار، نیزوں کی چمک، بندوقوں کی دھمک
 اور توپوں کی گھن گرج کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ زمین خاک و
 خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں سے ڈھکی ہے، سڑے ہوئے گوشت
 کی مکروہ بدبو اطراف میں پھیلی ہے۔ ایسی حالت میں کہاں اور کس
 طرح سکون و قرار میسر آ سکتا ہے۔

کوا: کیسی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہو۔ کیا ہم اور تم پرندوں ہی کی ایک
نسل میں سے نہیں ہیں؟ کبھی بھی روئے زمین کا ماحول ہمارے لئے
اس سے بہتر اور مناسب نہیں رہا۔ ہر جگہ ہمارے ہی لئے مخصوص ہو گئی
ہے۔ جہاں چاہیں اٹھیں بیٹھیں۔ اور ہم ہی کیا ہمارے بڑے بھائی
مثلاً گدھ وغیرہ بھی مست و سرگرم ہیں۔ زندگی عیش کی گذر رہی ہے۔
تم یہ کیا بیکار کی بجواس کر رہے ہو؟ آخر تم کیا چاہتے ہو۔ کیا تمہارے
نرم و نازک پیروں کے نیچے مخملی فرش بچھایا جائے جس پر تم ناز و
انداز کے ساتھ محو خرام ہو؟

کبوتر: یہ کوئی مذاق کا موقع نہیں۔ تم میری فطرت سے خوب
آگاہ ہو اور اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو کہ میں اس ماحول
میں کیوں نہیں ٹھہر سکتا۔

کوا: میں تو نہیں جانتا، مہربانی سے آپ خود ارشاد فرمائیں
کبوتر: یہ اپنی جگہ درست کہ ظاہراً شکل و صورت کے اعتبار
سے میں کافی حد تک تم سے ملتا جلتا ہوں۔ لیکن جہاں تک طینیت
کا سوال ہے خدا کا فضل کہ تمام دنیا امن کے پیامبر کے نام سے یاد
کرتی ہے۔

کوا: بہت خوب، پس مہربانی سے ثبوت پیش کیجئے۔
کبوتر: تم کو معلوم ہے مجھے صلح و آشتی کا فرشتہ سمجھا جاتا
ہے۔ پرانی روایات اور داستانیں اس کی گواہ ہیں۔ تم کو یاد ہو گا جب

حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بڑے طوفان میں ڈول رہی تھی، اور ابتدائی زمانے کی ساری مخلوق مع حضرت انسان اس میں ڈوبی جا رہی تھی تو آسمانی کتابوں کے مطابق اس وقت میں زیتون کی لکڑی کو اپنی چونچ میں پکڑ کر نوح علیہ السلام کی کشتی کے پیچھے پیچھے اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس ہی دن سے امن کے پیامبر کا لقب میری ذات سے منسوب ہے۔ چند ماہ سے میں اس فتنہ میں مبتلا ہوں کہ اہل زمین کے تئیں میں اپنی دیرینہ خدمات کو انجام دوں۔ لیکن ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ کیونکہ اب بھی اس پانی دنیا میں بہت سے بسبب، گولہ بارود، اسلحہ جات جنگ و جدال اور آدم کشی کے تمام اسباب موجود ہیں۔ میں ان کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔

گوا : اپنی مسکراہٹ کے لئے معذرت خواہ ہوں مگر میرے عزیز تم میری بات کو صحیح طور سے سمجھے نہیں۔ میری سنہی ایک تلخ فلسفہ کی غماز ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس دنیا میں ایک کی تکلیف دوسرے کی راحت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ تم اس جنگ و جدال کے سبب اذیت میں مبتلا ہو۔ لیکن میں، تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ مارے خوشی کے جامہ میں نہیں سماتا۔ اور لوگوں کی لاشوں کے مردار گوشت سے ہر لمحہ اپنے لئے ضیافت کا سامان مہیا کرتا رہتا ہوں۔ میں کس قدر خوش ہوں کہ خدا کی

اس وسیع و عریض دنیا میں میرے لئے ہر جگہ ہر لحظہ عیش و عشرت کا سامان مہیا ہے۔ اور افسوس تمہارے لئے پیر ٹکانے کی جگہ نہیں۔

کبوتر: اے خود غرض اور بد خو حیوان، اگر طوفان نوح کے دوران میں تمہاری بد خوئی سے ذرا بھی آگاہ ہو جاتا تو حضرت نوح علیہ السلام سے عدل و انصاف کی بھیک مانگ کر تمہارے ناپاک وجود کو اس ہی لمحہ ختم کر دیتا۔

کوا: اگر تمہارے ہاتھوں مجھے کوئی گزند پہنچتا ہے تو یقین کر و یہ بہت بڑا گناہ ہو گا۔ تم مجھے کس قصور پر سرزنش کرتے ہو۔ کیا تم کو اتنا بھی نہیں معلوم وہ کون سا حیوان ہے جو اس فتنہ و فساد اور قتل و غارت گری کی جرّے ہے۔ اس کی نسل کو مٹاؤ تو کوئی بات ہے۔

کبوتر: کیا تم گدھ کی بات کر رہے ہو؟

کوا: نہیں۔ گدھ نہ کسی سے مار پٹائی کرتا ہے اور نہ ہی اپنے ہم جنسوں کا خون بہاتا ہے۔ یہ موزی، درندہ صفت حیوان تو انسان ہے۔ اگر تم ایسے ہی سو رہا ہو تو نسل انسانی کو تہس نہس کر دو، تاکہ روئے زمین سے فتنہ و فساد کا خاتمہ ہو سکے۔

جلال آل احمد

جلال آل احمد ۱۹۲۳ء/۱۳۰۳ ش تہران کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ سیاست سے بھی ان کو خصوصی دلچسپی تھی۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر پی ایچ ڈی تک کی ڈگری اپنے ہی وطن سے حاصل کی۔

چوبیس سال کی عمر میں ان کی پہلی ادبی تحریر ”مجاہد سخن“ ایران سے (۱۹۴۵ء/۱۳۲۴ ش) سے شائع ہوئی اور ان کی شہسرت کا نقطہ آغاز قرار پائی۔

پہلا اور مشہور و معروف افسانوی مجموعہ ”دید و باز دید“ ہے، جس کو قبولیت

عام حاصل ہوئی۔ دبستان صادق ہدایت کے آل احمد دوسرے
نثر نگار ہیں جنہوں نے صادق چوبک کی مانند پسماندہ، غریب اور گناؤں
دیہات کے عام لوگوں کی زندگی کی بھرپور عکاسی اس طرح کی ہے کہ وہ
کردار ہمیں خود اپنے ہی معاشرے کے نظر آتے ہیں۔ ایران کے متوسط
ندہی گھرانوں کے ماحول کا تعارف لطیف طنز کے ساتھ کرایا ہے۔ دلچسپ
بات یہ کہ بعض اپنے ہی ہم جنسوں کی سفاکی اور بربریت کی تصویر کشی بھی
بڑی جرأت رندانہ کے ساتھ کی ہے۔

طرز نگارش دلنشین، زبان جذباتی ہم آہنگی کے ساتھ سادہ رواں
اور محاورہ ہے۔ افسانوں میں کبھی کبھی مضمون نگاری کا رنگ جھلکنے لگتا
ہے۔ تحریروں میں انقلابی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ سماج و معاشرے
کے اکثر کمزور پہلوؤں کو اس چابک دستی سے اجاگر کرتے ہیں کہ قاری
کا دل ہمدردی و غم گساری کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اور افسانوں کے
کرداروں کی کسک اپنے ہی دل کی چیخ معلوم ہونے لگتی ہے۔

تقریباً چھالیس سال دنیا کے نشیب و فراز، نرم و گرم دیکھنے
اور تلخ و شیرین کا مزہ چکھنے کے بعد ۱۹۶۹ء/ ۱۳۴۸ ش میں ہارٹ
ایٹیک کے صدمہ سے جان بر نہ ہو سکے اور اس سرائے فانی سے
کوچ کر گئے۔

آل احمد کے ادبی شاہکاروں کی فہرست طولانی ہے۔ ان
میں سے چند اس طرح ہیں :

زن زیادی ، از رنجی که میبریم ، سرگذشت کندوها ، نون و انقلم ،
مدیر مدرسه ، خسی در میقات ، سه تار ، نفرین زمین ، نسل جدید ، کارنامه
سه رساله ، ارزیابی شتابزده ، سه مقاله ، هفت مقاله ،
قمار باز ، بیگانه ، سو تفاهم ، دستهای آلوده تراجم ہیں۔

غیر کا بچہ

اب میں کیا کروں؟ میرا شوہر تیار نہیں کہ بچے کے ساتھ مجھے اپنے پاس رکھے۔ دراصل بچہ اس کا نہیں بلکہ میرے پہلے شوہر سے ہے جس نے مجھے طلاق کا زہر تو پلا دیا مگر خود اپنے ہی بچے کو پاس رکھنے کے لئے راضی نہیں ہوا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر کیا کرتا؟ مجھے بھی آخر زندگی بتانی ہے۔ اگر یہ شوہر بھی مجھے طلاق دے دیتا تو پھر میں کیا کرتی؟ آخر میں بچے کو اپنے سے الگ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ مجھ جیسی نا سمجھ گھریلو عورت اس کے علاوہ اور سوچ بھی کیا سکتی تھی۔ نہ میں کسی راستہ سے واقف اور نہ مسئلہ کے حل سے باخبر۔ اب ایسا بھی نہیں کہ میں چارہ کار سے بالکل

ہی انجان تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بچہ کو کسی چھوٹے بچوں کی نرسری میں داخل کر دیتی۔ یا کسی اور ابھانگن کی گود بھر دیتی۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا کہ وہ میرے بچہ کو بھی گود لے لیتے، اور کسی طرح کی مین میخ نکال کر مجھے شرمندہ نہ کرتے۔ اور بچہ کو بھی کسی طرح کا نام نہ دھرتے مگر میں موجودہ قضیہ کو اس انداز سے بھی انجام کو پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔

اس ہی شام جب میں اس نازیبا کام سے بادل نخواستہ فارغ ہو کر گھر واپس آئی تو تمام ماجرا اپنی ماں اور ہمسایوں سے بیان کیا۔ نام مجھے یاد نہیں آتا لیکن ان میں سے کسی ایک نے کہا، اچھا تم چاہتی تھیں کہ بچہ کو کسی نرسری میں ڈال دو یا کسی یتیم خانہ میں دے دو۔ اس کے علاوہ وہ لوگ اور کیا کیا کہتی رہیں۔ کچھ ذہن کام نہیں کرتا۔ لیکن اتنا دھیان پڑتا ہے کہ میری ماں نے اس وقت کہا، تم کیا سمجھتی ہو، وہ بچے کو لے لیتے ہیں خود بھی اس ہی ادھیڑ بن میں مصروف تھی۔ یہ گفتگو کانوں میں پڑتے ہی میرا دل ڈوبنے لگا اور میں نے خود سے کہا کیا تم نے ایسا تجربہ کرنے کی کوشش کی؟

اس کے بعد میں نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا: کاش میں نے ایسا ہی کیا ہوتا۔ لیکن نہ مجھے اندازہ تھا اور نہ ہی بھروسہ کہ وہ بچہ کو لے لیں گے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس عورت کے الفاظ نے میرے دل میں درد و غم کی ایک لہر دوڑا دی۔ بچے کا تو تلی زبان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا مجھے یاد آ کر میرا دل تڑپا گیا۔ میرے صبر و ضبط کے سارے بندھن

لٹ گئے۔ اور سب کے سامنے ہی بین کر کر کے رونے لگی۔ لیکن اب
 حاصل بھی کیا۔ خود اپنے کانوں سے میں نے کسی کو کہتے سنا جھوٹے لٹوے
 بہائے اب شرم نہیں آرہی۔ اس وقت بھی میری ماں نے میری حمایت
 کی اور میری دلہہی کرنے لگی۔ اور وہ سچ ہی کہہ رہی تھی۔ میری جوانی کا
 ابھی اولین دور ہے۔ ایک بچہ کے لئے آخر کا ہے کہ اتنا دل بھاری کروں؟
 اور وہ بھی ایسی صورت میں جب میرا شوہر بچے کے ساتھ مجھے اپنا نے پر تیار
 نہیں۔ ابھی بہت وقت ہے میں کئی بچوں کو جنم دے سکتی ہوں۔ یہ اپنے
 جگہ درست کہ وہ میرا پہلو ٹھی کا بچہ تھا۔ اور جو کام میں نے انجام دیا وہ
 مناسب بھی نہیں تھا۔ لیکن اب پچھانے سے کیا حاصل جب تیرکمان سے
 نکل چکا ہے۔ اور اس کو واپس نہیں لایا جاسکتا۔ آخر میں نے اپنی مرضی
 اور خواہش سے تو اس کام کو نہیں کیا بلکہ میرے شوہر نے اس کے لئے
 مجبور کیا تھا۔ اور اس کا بھی کہنا ٹھیک ہی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے
 کے بچہ کو اپنا لے۔ میں نے خود ہی سے انصاف کرتے ہوئے سوچا کہ نکاح نامہ
 میں ایسی کوئی شرط تو نہیں رکھی گئی تھی۔ اور کیا میں خود بھی سوتن کے
 بچہ کو اپنے بچہ جیسی محبت و شفقت کے ساتھ پال سکتی ہوں؟ کیا میں اس
 کو بوجھ نہیں سمجھوں گی۔ کیا شوہر کی کمائی میں اسے خوشی سے شامل کر لوں گی
 اسی طرح وہ بھی دوسرے کی اولاد کو پرورش کرنے کے لئے کسی بھی صورت
 تیار نہیں تھا۔ ان دو دنوں جب میں اس کے گھر تھی۔ بچہ موضوع بحث رہا
 اور پچھنی رات تو بہت کھل کر باتیں ہوئیں۔ اس کے دلائل کو میں نے توجہ

سے سنا۔ آخر میں جا کر میں نے کہا، اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میرے شوہر نے کہا۔ میں کچھ نہیں جانتا، جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ میں تو بس دوسرے کی اولاد کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ کہہ کر اس نے میرے لئے کوئی راہ چھوڑی ہی کہاں تھی، اس رات اس نے میرے پاس نہ آ کر ظاہر کیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ بہر حال تیسری رات ہم ایک ساتھ تھے۔ لیکن اس کا رویہ میرے ساتھ خفگی والا ہی تھا۔ میں خوب جانتی تھی اس کی ناراضگی کس لئے ہے۔ وہ چاہتا تھا بچہ سے متعلق کوئی فیصلہ کر کے میں عملی قدم اٹھاؤں۔ صبح گھر سے جاتے ہوئے دروازہ پر رک کر اس نے مجھے وارننگ دی کہ دوپہر واپسی پر میں بچے کو گھر میں نہیں دیکھنا چاہتا۔

میرے دکھ کی ابتدا اس ہی لمحہ سے ہوتی ہے۔ اب جتنا بھی سوچتی ہوں یہ چیز میری فہم سے بالاتر ہے کہ بچے کو جدا کرنے پر میرا دل کس طرح رضا مند ہو گیا، لیکن میرے سامنے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ چادر سر پر ڈالی بچہ کا ہاتھ پکڑا اور شوہر کے جانے کے بعد گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ میرا بچہ تین سال کا تھا اور اچھی طرح اپنے آپ پیروں پیروں چل سکتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے تین سال اس کی پرورش میں لگائے تھے۔ نو مہینہ پیٹ میں رکھا تھا۔ اس کی دیکھ بھال سے متعلق تمام زحمات اب تمام ہو چکی تھیں۔ اور راتوں کی جگہ سے راحت مل چکی تھی۔ لیکن مرتنا گیا نہ کرتا میں اسے الگ کرنے پر مجبور تھی ٹیکسی اسٹینڈ تک اس کے ساتھ پیدل گئی۔

میں نے بچے کو نئے جوتے اور آسمانی رنگ کا وہ بنا جوڑا پہنایا تھا جو میرے پہلے شوہر نے آخر وقت میں خرید کر دیا تھا جس وقت میں بچے کو بنایا سوٹ پہنا رہی تھی تو ایک بار میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں بچے کو یہ کپڑے پہنا کر بیکار کر رہی ہوں؟ لیکن میرا دل نہ مانا۔

میں نے دل میں سوچا اگر میں دوبارہ سے صاحبِ اولاد ہوگی تو میرا شوہر اس کے لئے اور کپڑے خرید لائے گا۔ پس میں نے اس کو بنایا لباس پہنا دیا۔ بالوں میں کنگھی کی۔ اس وقت وہ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ میرے نے ایک ہاتھ سے اس کی انگلی پکڑی۔ دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر کو کمر کے پاس سے تھام لیا تاکہ وہ گر نہ پڑے۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ اس وقت یہ مناسب بھی نہیں تھا کہ بچے کو تیز چلنے کے لئے ڈانٹوں۔ یہ تو آخری موقع تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑے گلی کوچوں میں چل رہی تھی۔ دو تین جگہ اس نے چاہا کہ میں اسے لالی پاپ دلا دوں لیکن میں نے اس کو سمجھایا پہلے ہم گاڑی میں سوار ہو لیں پھر لالی پاپ خریدیں گے۔ مجھے یاد آ رہا ہے اس دن بھی وہ گزشتہ دنوں کی مانند مجھ سے سوال پہ سوال کئے جا رہا تھا۔ ایک گھوڑے کا پاؤں پانی سے بھرے گھڑے میں پھنس گیا تھا اور لوگ اس کے اطراف جمع تھے۔ وہ بھی مجھ سے صند کرنے لگا کہ اس کو اٹھا کر اونچا کروں، تاکہ وہ بھی دیکھ سکے کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو اوپر اٹھایا اس نے گھوڑے کے زخمی اور خون سے بھرے پاؤں کو دیکھا تو گود سے زمین پر اترنے کے بعد بولا، اماں

اس کا ہاتھ تو تھ دیا ہے (ٹوٹ گیا ہے) میں نے جواب دیا، ہاں! میری جان اس نے اپنی ماں کا کہنا نہیں مانا اس لئے اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ اسی طرح باتیں کرتے ہم دھیرے دھیرے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھتے رہے۔ ابھی سویرے سویرے کا وقت تھا اور ٹیکسیاں بھری ہوئی چل رہی تھیں۔ تقریباً آدھا گھنٹہ ٹیکسی کے انتظار اور تلاش میں گزر گیا۔ بچہ الگ پریشان کئے جا رہا تھا اور میں تھکن سے چورنگے کے مستقل سوالوں سے گھبراتا جا رہی تھی۔ اماں اب تا ہودا، داری تو نہیں آئی اے۔ اتنا ہم تنیں، لالی پاپ خریدیں (اماں اب کیا ہوگا؟ گاڑی تو نہیں آرہی ہے۔ اچھا ہم چلیں، لالی پاپ خریدیں) میں نے اسے تسلی دی، دیکھو ابھی گاڑی آجائے گی۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد لالی پاپ خریدیں گے۔ آخر کار سات نمبر والی بس نے ہمیں میدان شاہ تک پہنچا دیا۔ بس میں سوار ہونے کے بعد بھی بچہ مسلسل کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ مجھے یاد آتا ہے ایک دفعہ اس نے پوچھا، اماں ہم کہاں جا رہے ہیں؟ (اماں ہم کہاں جا رہے ہیں؟) نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ ابا کے پاس چل رہے ہیں، میری طرف تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد اس نے سوال کیا، اماں تو ن سے ابا؟ (اماں کون سے ابا؟) اب میرے اندر صبر کا یار نہیں رہا اور جھنجھلا کر بولی، میری جان تم کتنا بولتے ہو۔ ایسا کرو گے تو تمہیں لالی پاپ خرید کر نہیں دوں گی۔ اب سوچ سوچ کر میرا دل کیسا مل مل رہا ہے۔ ایسا دھکی آمیز لب و لہجہ بچہ کا دل چھوٹا کر دیتا ہے۔ مجھے آخری وقت میں اس کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہئے تھی۔ گھر سے نکلنے وقت میں نے دل میں

یہ فیصلہ کیا تھا کہ بچہ پر غصہ نہیں کروں گی۔ نہ ماروں گی اور نہ ڈانٹوں گی۔ بلکہ جدائی کے ان آخری لمحات میں اس کے ساتھ انتہائی محبت اور شفقت کا برتاؤ کروں گی۔ لیکن اب میرا دل کیسا کسمسار ہا ہے۔ میں نے کیوں بچے کو جھڑک کر خاموش کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر تو وہ چپ رہا پھر طفلانہ عادت کے تحت بس کندھ کھڑکے ساتھ منہ چڑا چڑا کر ہنسنے ٹھہرنے میں لگ گیا۔ میں نے اپنے بچے کو ڈپٹ کر اس قابل ہی کہاں چھوڑا تھا کہ وہ میری طرف متوجہ ہو۔ میدان شاہ پہنچنے تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ بس سے اترنے کے بعد بھی بچہ ہنس رہا تھا۔

میدان شاہ میں ٹریفک کی آمدورفت سے کافی ہنگامہ تھا میں ابھی بھی وحشت زدہ تھی کہ اپنے ارادہ کو کیونکر عملی جامہ پہناؤں۔ بہت دیر غائب آدھے گھنٹہ تک میں ٹھہلا کی یہاں تک کہ گاڑیوں کی آرجا میں کمی آگئی۔ میدان کے ایک کنارے جا کر میں نے ایک بوڑھے سے دس پیسہ نکالے اور بچے کی طرف بڑھائے میرا اعلیٰ حیرت سے میرا منہ تنک رہا تھا۔ کیونکہ ابھی اس کو پیسہ پکڑنا آیا ہی کہاں تھا؟ میری عقل کام نہیں کرتی تھی اس کو کس طرح سے سمجھاؤں۔ میدان کی دوسری طرف سے تلے ہوئے کدو کے نمکین بیج بیچنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے انگلی سے اس طرف اشارہ کر کے کہا لو پیسہ پکڑو اور خود جا کر خرید لاؤ۔ دیکھو تم کو خریدنا آتا بھی ہے یا نہیں؟ بچہ نے ایک نظر پیسہ کی طرف ڈالتے ہوئے کہا اماں آؤ تم بھی تلو (چلو) نہیں میں ہیں کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہوں،

تاکہ دیکھوں تم کیسے جا کر خریدتے ہو۔ بچہ نے پھر پیسہ کی طرف ہچکچاہٹ کے ساتھ دیکھا۔ کیونکہ میں نے ابھی تک بچہ کو اس طرح کی کوئی تربیت دی ہی کب تھی وہ مجھے ٹمک ٹمک تکے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اس لمحہ ایک عجیب سی چیز تھی جس نے میرے دل کو بے قابو کر دیا اور مجھے اپنا ارادہ متزلزل نظر آنے لگا۔ میرے دل کی ایسی کیفیت نہ اس سے پہلے کبھی ہوئی تھی اور نہ بعد میں۔ حتیٰ کہ اس دن کی شام بھی نہیں جب میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو نکھودینے کے بعد ہمسایہ کے دروازہ پر کھڑی غم و اندوہ کی شدت سے ہلک ہلک کر رو رہی تھی۔ اس لمحہ اس کی نظریں نہ جانے کیا تھا حیرت و استعجاب کے ساتھ آنکھوں میں کچھ سوال۔ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں نے دوبارہ اشارہ کر کے کہا، بسم اللہ، بسم اللہ، میرے چند اجاؤ، پیسہ اس آدمی کو دے کر کہو مجھے بھنے ہوئے زچہ دے دو میرے معصوم بچے نے نمکین کدو کے بیجوں کی طرف دیکھا اور روئی آواز بنا کر بہانہ کیا۔ نیس اماں مجھے بیج نہیں تاہیں (چاہئیں) مدھے تو تیسہس پسند ہیں۔ (مجھے تو کشمش پسند ہیں) میری حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ اگر بچہ تھوڑی دیر اور لگا دیتا یا رونا شروع کر دیتا تو یقیناً میرے فیصلہ کے پائے استحکام میں لغزش آجاتی۔ لیکن وہ رویا نہیں۔ مجھے غصہ آنے لگا اور اپنے اوپر اختیار نہیں رہا۔ چیخ کر بولی، اس کے پاس کشمش بھی ہے جو تمہارا دل چاہے لے لو۔ یہ کہتے ہوئے فٹ پاتھ کے کنارے بہتے ہوئے نالے سے بچہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر دوسری طرف سڑک پر چھوڑا اور

ہاتھ سے آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا، جلدی جاؤ دیر ہو رہی ہے۔
 اس وقت سڑک بھی یہاں سے لے کر نکلے تک خالی تھی۔ نہ کوئی بس
 آ جا رہی تھی اور نہ موٹر رکشہ وغیرہ کہ بچہ اس کی جھپٹ میں آ جائے۔ نا سمجھ
 بچہ دو تین قدم آگے بڑھ کر پھر پلٹا اور بولا، اماں تیسیس بھی اس کے
 پاس ہے۔ ہاں میرے لعل، تم اس سے دس پیسہ کی کشمش مانگ لو۔ وہ چلا گیا۔
 ابھی سڑک کے درمیان ہی پہنچا تھا کہ ایک گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی
 دی۔ لپک کر وہاں پہنچی جھپٹ کر بچہ کو گود میں اٹھایا اور تیزی کے ساتھ جمع
 کے درمیان فٹ پاتھ پر آگئی۔ میرا سانس پھولا ہوا اور جسم پسینہ سے شرابور تھا۔
 وہ پوچھنے لگا، اماں تاہو دیا؟ (کیا ہو گیا؟) کچھ نہیں بیٹا، سڑک کو
 جلدی سے پار کر لینا چاہئے۔ تم آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اگر گاڑی
 کے نیچے آجاتے تو؟ یہ کہتے کہتے میں رو پڑنے کو تھی کہ اس نے میری گود ہی
 میں کہا، اماں! تم مدھے دین پر ہی اتنا لدو، اب میں دلدی دلدی
 داؤں گا۔ اچھا اماں تم مجھے زمین پر اتار دو اب میں جلدی جلدی جاؤں گا،
 اگر میرا بچہ اپنی معصومیت سے یہ جملہ نبول جاتا تو میں بھول چکی تھی کہ کس
 مقصد سے آئی ہوں۔ ابھی آنکھوں کے آنسو خشک بھی نہیں کئے تھے کہ شوہر
 کا غضبناک چہرہ میری نظروں کے سامنے آ کر یاد دلانے لگا کہ میں کس کام
 کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ میں نے بچے کو چوما اور گود سے اتارتے ہوئے
 اس کے کان میں کہا، میرے لعل! اس سے پہلے کہ کوئی گاڑی آجائے
 تم تیزی سے سڑک پار کر لو۔ اس بار وہ اپنے ننھے منے پیروں سے لمبے لمبے

ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھا، میں ڈر رہی تھی کہیں پاؤں لڑکھڑانہ جائیں، وہ
 مگر نہ پڑے۔ لیکن وہ سڑک کی دوسری طرف پہنچ ہی گیا۔ میں اپنی چادر
 کے کونوں کو بغل میں سمیٹ کر آگے کی طرف بڑھنے ہی والی تھی کہ اس
 نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میں اپنی جگہ ٹھٹھک گئی اور میرے قدم
 جیسے اس مقام پر جم سے گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ میں بچے پر ظاہر کرنا چاہتی تھی
 کہ میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ بلکہ مجھے اپنی حالت اس چور کی سی لگ
 رہی تھی جس کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ میرے ہاتھ بغل کے بغل میں
 رہ گئے بالکل اس روز کی مانند جب میں اپنے بچھلے شوہر کی جیب سے
 کچھ نکالنا چاہتی تھی اور اچانک وہ دروازہ پر نمودار ہو گیا تھا، یکایک
 میرا پورا جسم پسینہ سے نہا گیا۔ میں نے مجرموں کی مانند اپنا سر نیچے جھکا لیا
 اور جب بڑی مشکل سے اوپر اٹھایا تو دیکھا وہ چل پڑا تھا اور بیچ والے
 کے پاس پہنچنے ہی کو تھا۔

بچہ خیریت کے ساتھ اس طرف پہنچ گیا۔ میرا کام پورا ہوا، اور میں
 نے بھلا دیا کہ وہ میرا بچہ تھا۔

میں نے اس پر آخری نگاہ یوں ڈالی جیسے وہ کسی غیر کا پیارا پیارا دل
 موہ لینے والا بچہ ہو۔ اور تیزی کے ساتھ فٹ پاتھ کے مجمع میں اپنے آپ کو گم
 کر لیا۔ اس ہی دوران ایک بار پھر میرے اوپر وحشت کا ایسا غلبہ طاری
 ہوا کہ میں اپنی جگہ دم بخود رہ گئی۔ مانو کسی نے میرے پیروں میں بیڑیاں
 پہنا دی ہوں۔ ایک ہول دل میں سما گیا۔ کسی نے کہیں یہ ناشائستہ حرکت

موتے مجھے دیکھ تو نہیں لیا۔ اس احساس کے تحت میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ مارے گھبراہٹ کے تیز رفتاری کے ساتھ ایک ہی سانس میں، میں نے دو تین گلیاں پار کر لیں اور چاہا کہ اپنے آپ کو ان ہی گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم کر لوں۔ گرتے پڑتے جب اس گلی کے سرے پر پہنچی تو ایک دم سے کسی نے میرے سر پر گارڈی کا ہارن بجایا۔ مجھے یوں لگا جیسے چوراہے کا ٹریفک کانٹبل ٹیکسی میں سوار ہو کر میرا پیچھا کر رہا ہو اور ابھی اتر کر مجھے گرفتار کر لے گا۔ خوف سے میری ہڈیاں بھی کانپ گئیں۔ میں نہیں جانتی کس غیبی طاقت کے تحت آگے بڑھنے سے پہلے میں نے گھوم کر دزدیدہ نگاہوں سے سامنے کی طرف دیکھا تو نظر پڑا ٹیکسی کے مسافر کرایہ ادا کر کے جارہے ہیں۔ میں نے سکوں کا ایک سانس لیا، اور اچانک ہی ایک دوسرا خیال بجلی کے کوندے کی مانند میرے دماغ میں لپکا۔ بغیر سمجھے بوجھے میں جھپٹ کر ٹیکسی میں سوار ہو گئی۔ اور تیزی کے ساتھ اس کا دروازہ سختی سے بند کر لیا۔

ڈرائیور ہارن بجاتا روانہ ہوا۔ میری چادر کا کونہ دروازہ میں پھنس گیا تھا۔ جب ٹیکسی دور نکل آئی اور میرے حواس بجا ہوئے تو میں نے دھیرے سے دروازہ کھول کر اپنی چادر کا پلو نکال لیا اور پھر آہستگی سے اسے بند کر کے سیٹ کی پشت سے مڑکا کر ایک اطمینان بھرا سانس کھینچا۔ لیکن نتیجہ رات کو اپنے شوہر سے ٹیکسی کا کرایہ بھی وصول نہیں کر سکی۔

صادق ہدایت

سنہ ۱۹۰۳ء / سنہ ۱۲۸۱ھ شہر تہران میں اعتضاد الملک ہدایت کے گھر میں صادق نام کا ایک چراغ روشن ہوا، جو وقت گزرنے کے ساتھ افسانہ نگاری کی جدید دنیا کو منور کر گیا۔ بے شک ایرانی داستان نویسی کے فن میں صادق ہدایت کو سنگ میل کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

میٹرکولیشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے پیرس گئے۔ سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن چونکہ طبیعت ادھر راغب نہ ہوئی، انجینئرنگ چھوڑ کر ادبیات کی طرف آ گئے۔ فرانسیسی ادبیات کے ساتھ ساتھ قدیم زبانیں سنسکرت اور پہلوی کو بھی تندہی سے سیکھنے لگے۔

پیرس کے دوران قیام ہی (۱۲-۱۳۰۶ ش) صادق کے ادبی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے افسانوی مجموعہ جدید فارسی ادب میں ایک اہمیت اور انفرادیت کے حامل ہیں۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ ”قطرہ خون“ زندہ بگور، سایہ روشن، اوسانہ، افسانہ آفرینش اور نیرنگستان کا نام لیا جاسکتا ہے۔ بوف کور، جادہ نمناک اور سفرنامہ ای اصفہان بھی اس ہی دور کی یادگار ہیں۔

صادق ہدایت (۱۳۱۵ ش) تہران سے ہندوستان گئے اور ایک سال کے عرصہ تک بمبئی میں رہ کر پورے ذوق و شوق سے پہلوی زبان پر عبور حاصل کرنے میں لگے رہے۔

(۱۳۲۰ ش) ”سگ و لگرد“ کی تصنیف سے دوبارہ اپنا ادبی سفر شروع کرتے ہیں۔ اور حاجی آقا، ولنکاری، آب زندگی جیسے ادبی پارے وجود میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہدایت نے پہلوی اور فرانسیسی زبانوں سے تراجم کا کام بھی کیا۔ چند ڈرامہ بھی لکھے۔ اس طرح ان کی علمی و ادبی کاوشوں کی تعداد انتہائی تصانیف تک پہنچتی ہے۔ ان کے بہترین ادبی نمونوں کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ہدایت کے قلم میں توانائی، روانی اور افکار میں نیا پن ہے۔ وہ عوام کی زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ انسان دوستی، وطن پرستی اور محبت و دردمندی کا مجسمہ ہیں۔ ساری زندگی دوسروں کے غم کو اپنی تحریروں کے ذریعہ بانٹتے رہے۔ مگر اپنا درد کبھی بیان نہ کیا۔ زبان سادہ

اور دل نشین ہے۔ البتہ افراط و تفریط سے پاک نہیں۔ روزمرہ محاورات کا استعمال ایک حسن کے ساتھ کرتے ہیں۔ افسانہ نویس کے میدان میں ایک نئے باب کے موجد کہے جاتے ہیں۔ ایران کے عوام کی زندگی کے ہر گوشہ کو جس خوبصورتی کے ساتھ روشناس کرایا ہے وہ صرف ان ہی کا حق ہے۔ صادق کی ادبی شخصیت کو ایک 'دبستان' کی حیثیت حاصل ہے۔

عربی، فرانسیسی اور پہلوی زبانوں پر عبور تھا۔ معاشی زندگی کی ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے بادل خواستہ ساری زندگی سرکاری نوکری کرنے پر مجبور رہے۔ ادبی سرگرمیوں مکمل طور آزادانہ انجام دینے کی غرض سے شادی کے جھیلے میں بھی نہیں پڑے۔ ایران سے دل اوب گیا تو پھر پیرس چلے گئے۔

۱۹۵۱ء/۳۰ ۱۳ ش، زندگی کے تقریباً سینتالیس سال گزارنے کے بعد خودکشی کر کے جان، جاں آفریں کے حوالے کر دی۔
کچھ تصانیف اس طرح ہیں:

پروین دختر ساسان (ڈرامہ)

فوائد گیاه خواری

علویہ خانم

سایہ مغول

مردہ خوربا

مازیار وغیرہ

کبراد داؤدؑ

نہ... نہ... ہرگز بھی ایسا کام نہیں کروں گا۔ خود دوسروں کے لئے تو ضرور خوشی کا باعث ہو سکتا ہے جبکہ خود میرے لئے بہت تکلیف دہ اور پریشان کن ہے۔ ایسی صورت میں یقیناً اس امر کی طرف سے مکمل چشم پوشی کرنا چاہئے۔ نہیں... کبھی نہیں۔

اپنی چھوٹی سی لاٹھی کو زمین پر ٹبک کر مشکل اپنی راہ رست کرنا، زیر لب بر بڑاتے ہوئے داؤد دلوں چلا جا رہا تھا جیسے خود اس سے اپنے بدن کا لوجھ سنبھالے سنبھل رہا ہو۔ پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ

باریک کمان دار ابرو نیچے کو جھکی ملکیں، زرد رنگ اور ہڈیوں سے
 ابھرے رخساروں والا اس کا بڑا سا چہرہ دبے پتلے شانوں کے
 درمیان سامنے کونکے ہوئے سینے پر ٹکا ایک عجیب کریمہ منظر پیش
 کرتا۔ ساتھ ہی کبڑے پشت، لمبے بے ڈھنگے ہاتھ بڑی سی آگے کو
 ڈھلکی ہوئی ٹوپی والے سر نے اس کے حلیہ کو اور مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔
 اس وضع قطع کے ساتھ سختی سے لاٹھی کو زمین پر ٹک کر چلتے، جب
 لوگ دور سے اس کی چوں چوں کے مربہ جیسی شکل کو دیکھتے تو اپنے
 دلوں کے اندر تمسخر اور رحم کے ملے جلے احساس کو روک نہیں پاتے
 تھے۔

راؤد "خیابان پہلوی" کے نکرٹے سے نکل کر شہر کی باہری سڑک
 پر ہوتا ہوا "دروازہ دولت" کی طرف چلا جا رہا تھا۔ مغرب کا وقت
 قریب تھا، ہوا میں کچھ گرمی آچلی تھی۔ اگلے ہاتھ کی طرف ہلکی ہلکی روشنی
 میں نہائے کچھ کچے مکان اور میٹ کی دیواریں آسمان کی سمت اپنا
 منہ اٹھائے غروب آفتاب کا نظارہ کرنے میں محو تھیں۔ دائیں جانب
 تازہ پانی بھری ہوئی خندق کے کنارے نیم تیار کے مکان دکھائی
 دے رہے تھے۔ یہاں نسبتاً خاموشی چھائی ہوئی تھی جس کو کبھی گزرنے
 والی موٹر اور بکریوں کی آواز توڑ دیتی اور پانی کے چھڑکاؤ کے باوجود
 کچھ نہ کچھ گرد و غبار اڑاتی ہوئی اس سڑک سے گزر جاتیں جس
 کے دونوں طرف نالوں کے کنارے نئے نئے درخت لگے ہوئے تھے۔

وہ سوچ رہا تھا بچپن سے لے کر اب تک یا تو اس کی زندگی دوسروں کے رحم و کرم پر گزری یا پھر لوگوں کے لئے تفریح کا ذریعہ بنا رہا۔ انہی سوچوں میں گم اسے تاریخ کے استاد کا وہ پہلا سبق یاد آیا جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ اسپارٹا کے باشندے ناقص بچوں کو مار ڈالا کرتے تھے۔ اس وقت تمام بچوں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور اس کے اوپر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ لیکن اب خود اس کے دل میں یہ آرزو کروٹیں بدل رہی تھی، کاش ایسا قانون پوری دنیا میں نافذ ہو جاتا یا کم از کم کچھ ہی جگہوں پر ناقص اشخاص کی شادیوں پر پابندی لگا دی جاتی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا سارا قصور اس کے باپ کا ہے۔ جس کی اڑی اڑی رنگت، اندر کو دھنسی کا لے حلقوں والی آنکھیں ادھ کھلا منہ، اس حلیہ کے ساتھ ہی موت سے تھوڑی دیر پہلے والا اسے اپنے باپ کا وہ منظر یاد آیا جو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا اس کے بوڑھے باپ نے ایک جوان لڑکی سے شادی کی تھی۔ اور اس کے سارے بچے اندھے اور مفقود اس دنیا میں آئے تھے۔ اس کے بھائیوں میں جو ایک زندہ بچ گیا تھا وہ بھی گونگا اور فاطر العقل تھا۔ اور اس کے انتقال کو بھی پورے دو سال بیت چکے تھے۔ یادوں کی ان بھول بھلیوں میں پھٹکتا وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا شاید وہ لوگ خوش قسمت تھے۔

لیکن وہ خود اپنے وجود سے بیزار اپنوں سے نالاں، زندہ رہ گیا
 گیا تھا۔ اور دوسرے بھی اس سے گریزاں ہی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بچپن
 ہی سے تنہائی اس کا مزاج بن گئی تھی۔ اس ہی عادت کے پاداش
 کھیل کود، دوڑ بھاگ منہی مذاق جیسے فرحت بخش مشاغل سے وہ
 محروم رہا جو بچوں کے لئے معصوم خوشیوں کا سبب ہوتے ہیں۔ وہ
 کھیل کے اوقات میں ان مسرتوں سے گریزاں، مدرسہ کے میدان
 کے ایک گوشہ میں اپنے چہرے کے آگے ایک کتاب کھول کر بیٹھ
 جاتا۔ ساتھ ہی چوری چوری کن آنکھیوں سے بچوں کو دیکھا بھی کرتا تھا۔
 لیکن کبھی کبھی سنجیدگی اور دل جمعی کے ساتھ پڑھتا بھی تھا جس
 کے پس پردہ یہ خواہش چھپی تھی کہ کم از کم پڑھائی میں محنت کر کے
 دوسروں پر فوقیت حاصل کر سکے۔ اس ہی دُھن میں مگن رات
 دن مطالعہ میں لگا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ دو کند ذہن اور سست طالب علم
 اس سے محض اس لئے گرم جوشی کے ساتھ پیش آتے تھے تاکہ اس
 وسیلہ سے ریاضی اور دوسرے مضامین کی مشکلات کو اس کی مدد
 سے حل کر سکیں۔ اور ہر روز کی مشق کو اس کی کاپی سے نقل کر لیں۔
 وہ خود بھی اس حقیقت سے واقف تھا کہ ان کی دوستی بغیر کسی غرض
 کے نہیں۔ اس کے برعکس وہ دیکھتا تھا کہ حسن خان کی خوب صورتی،
 دیدہ زیبی اور خوش لباسی کے سبب لڑکے اس سے دوستی
 کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ اساتذہ میں بھی صرف دو تین

استاد ہی ایسے تھے جو اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرتے تھے۔
اور وہ بھی اس کی صلاحیت اور استعداد کے سبب نہیں، بلکہ
انہی راہ ہمدردی و ترخم۔ چنانچہ تمام کاوشوں اور جانفشانیوں کے
باوجود وہ اپنی اس خواہش کو پورا نہ کر سکا کہ دوسروں کی توجہ کا
مرکز بن سکے۔

اب وہ اس دنیا میں اکیلا تھا۔ سب لوگ اس سے گریزاں
دوست اس کی رفاقت سے دامن بچاتے اور اس کی ہمراہی کو
اپنے لئے باعث عار سمجھتے۔ عورتیں اس کو کبڑا کہہ کر مخاطب کرتیں۔
اور یہی چیز اس کے دل میں سب سے زیادہ کانٹے کی طرح کھٹکتی
تھی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے اس نے دو جگہ شادی کے پیغام
بھیجے لیکن دونوں ہی بار ان لڑکیوں نے اس کا مذاق اڑایا،
تھا۔ اتفاق سے ان لڑکیوں میں ایک زینبہ نام کی وہ لڑکی بھی
تھی جو قریب ہی فیشر آباد میں رہتی تھی اور کئی بار وہ لوگ ایک
دوسرے کو راستہ بیچ نہ صرف یہ کہ دیکھ چکے تھے بلکہ گاہے ماہے
بات چیت بھی ہو چکی تھی۔ شام کے وقت جب وہ اسکول سے
واپس آتا تو اس راہ سے ضرور گذرتا جہاں اس کا دیدار ہو سکتا
تھا۔ اس دزدیدہ نگاہی کے نتیجے میں اس کو صرف اتنا یاد آتا کہ اس
کے لب کے کنارے ایک سیاہ تل تھا۔ اس نے اپنی خالہ کو جب
وہاں پیغام لے کر بھیجا تو اس لڑکی نے بھی داؤد کا ان الفاظ کے

ساتھ مذاق ہی اڑایا تھا کہ دنیا میں کیا آدمیوں کا قحط پڑ گیا ہے جو میں ایک کبڑے کی — بیوی بننا منظور کر لوں؟ ماں باپ کے اصرار اور سرزنش کے باوجود بھی وہ لڑکی کسی طرح رضامند نہیں ہوئی اور یہی کہتی رہی کیا دنیا میں آدمیوں کا قحط ہے۔ پھر بھی آج تک وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی جوانی کی یادوں کا تنہا رنگین مرکز تھی۔ اب بھی جانے یا انجانے طور پر داؤد کا گذر اس ہی راہ سے ہوتا اور پرانی یادیں تازہ ہو کر اس کی نظروں کے سامنے اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ پردہ سیمی کی مانند گذر جاتیں۔ زندگی کی ان کش مکشوں سے اب وہ عاجز آچکا تھا۔ لوگوں سے علیحدگی اور فاصلہ کی تلاش میں وہ اکیلا گھومتا گھا متا دور نکل جاتا۔ راہ میں جب کسی کو آپس میں مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے دیکھتا تو فوری اس کے ذہن میں خیال آتا کہ ضرور یہ میرے ہی بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی خوش گپیوں اور مذاق کا موضوع میں ہی ہوں۔ وہ اپنے بڑے بڑے بھینس جیسے دیداروں کے ساتھ اکرطی ہوئی گردن کو بڑی مشکل سے پیچھے کی طرف موڑتا اور حقیر آمیزہ زنجی نظروں سے ان کو دیکھتا ہوا گذر جاتا۔ اور اس کا تنہا ہوا چہرہ پورے وجود کے ساتھ سراپا گوش بنا ان لوگوں کی گفتگو پر لگا رہتا تا کہ اپنے بارے میں دوسروں کی رائے جان سکے۔

نالے کے کنارے کبھی کبھی اپنی لاٹھی سے بہتے پانی کو چھڑتا ہوا وہ آہستہ آہستہ یونہی سوچ بچار کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے پریشان خیال بکھرے بکھرے سے تھے۔ اسی بیچ ایک دفعہ اس کی لاٹھی ایک پتھر سے ٹکرائی جس کی آواز پر چونک کر ایک سفید بالوں والے کتے نے اپنا سراٹھا کر ناگواری کے تاثرات سے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنا سر زمین پر ڈال دیا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے مرنے کے قریب ہو۔ اور اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی سکت بھی اس کے اندر نہ رہ گئی ہو۔

اپنے کبڑے وجود کے ساتھ داؤد بمشکل کتے کی طرف جھکا اور چاند کی روشنی میں ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ جس کے نتیجے میں ایک عجیب و غریب قسم کے خیال نے اس کے ذہن میں اپنا سراٹھایا۔ اسے لگا شاید یہ پہلی سادہ نظر ہے جس میں طنز کی کوئی آمیزش نہیں سوائے محبت اور یگانگت بھرے اس احساس کے کہ ہم دونوں ہی بد بخت ہیں جن کو دنیا والوں نے بیکار سمجھ کر ٹھکرا دیا ہے۔ اس کا دل چاہا ذرا دیر کے لئے اس کتے کے پہلو میں بیٹھ جائے جو اپنی بد بختی کے سایہ میں لوگوں کی نظروں سے دور، شہر سے کشاں کشاں یہاں چلا آیا ہے اس کے سر کو اپنے ابھرے ہوئے سینے سے لپٹا لے۔ ساتھ ہی غیر شعوری طور پر یہ خیال بھی اس کے ذہن میں کوندے کی مانند لپکا کہ اگر

کسی نے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا تو، وہ پہلے سے بھی زیادہ مذاق کا موضوع بن جائے گا۔

مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا۔ رات کے ابتدائی وقت میں افق سے ابھرتے چاند کی روشنی میں بنائے ”یوسف آباد“ کے دروازہ کی طرف اس نے دیکھا جہاں لوٹے پھوٹے گھر جا بجا اینٹوں کے بکھرے ہوئے ڈھیر، درختوں کے سائے میں نظر آنے والا خواب آلود شہر، مکالوں کی پشت پر لہراتے پردے اور خاکستری پہاڑ نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہی اور تنہائی کے سائے منڈلانے لگے۔ آس پاس کوئی ذی نفس نہیں تھا۔ سوائے ابو عطا چوکیدار کی دھیمی آواز کے جو خندق کی دوسری طرف دور سے آتی سنائی پڑتی تھی۔ اس نے با وقت تمام غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا، پتھر مردہ اور رنج و غم کی شدت سے جلتی ہوئی آنکھوں والا سراور پر اٹھایا جو اس کے لئے ایک ناگوار بوجھ تھا۔

داؤد نے اپنی لاٹھی کو نالے کے کنارے رکھا اور غیر ارادی طور پر نالے کو پار کر کے راستہ کے سرے پڑے ہوئے پتھروں پر جا کر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی اس کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی جو برفی میں لپیٹے نالے کے سہارے فٹ پاتھ پر بیٹھی تھی۔ اس کا دل تیزی کے ساتھ اس کے پہلو میں دھڑکنے لگا۔ اس لڑکی نے بغیر کسی سلام و دعا کے مسکراتے ہوئے اپنا چہرہ اس کی طرف کر کے کہا ”ہوشنگ

اب تک تم کہاں تھے؟“

اس سادہ لب و لہجہ پر داؤد کو حیرت ہوئی کہ اس نے نہ کوئی مذاق اڑایا اور نہ ہی راہ فرار اختیار کی۔ اس کو لگانے کی کسی نے دونوں جہاں کی دولت اس کی جھولی میں ڈال دی ہو۔ لڑکی کے انداز مخاطب سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ لیکن رات کے وقت وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ کیا وہ شریف زادی ہے۔ شاید وہ عاشق ہو گئی۔ بہر حال اس نے انخام کی پرواہ کئے بغیر فیصلہ کیا۔ مجھے کم از کم اس سے بات چیت تو کرنا ہی چاہئے۔ ممکن ہے وہ میری غم گساری کرے؟ یہ سوچتے سوچتے اس کو اپنی زبان پر تابو نہ رہا اور بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ کیا آپ اکیلی ہیں؟ میں بھی ہمیشہ سے اکیلا ہوں اور اس ہی تنہائی کے سناٹے میں آج تک زندگی کاٹ دی ہے۔ ابھی اس کا جسدہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ کالے چشمہ والے چہرے کو دوبارہ اس کی طرف موڑ کر اس نے کہا۔ پھر آپ کون ہیں؟ میں تو سمجھی ہوشنگ ہے کیونکہ وہ جب بھی آتا ہے مجھ سے مذاق کرتا ہے۔

آخری جملے کو داؤد نہیں سن پایا۔ پھر ایسے جواب کی اسے توقع بھی نہیں تھی۔ اس کو تو صرف اتنا یاد رہا کہ عرصہ دراز کے بعد کوئی خوبصورت لڑکی اس سے مخاطب ہوئی ہے۔ اس کے

جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ بہہ نکلا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر اس نے کہا : نہیں۔ میں ہوشنگ نہیں ہوں۔ میرا نام تو داؤد ہے۔ اس عورت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا : اپنی آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے میں آپ کو دیکھ نہیں سکتی۔ آ۔ ہاں۔ یاد آیا داؤد، کبڑا دا۔۔۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبایا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”مجھے آپ نے پہچانا، میں زمیندہ ہوں“ یہ آواز مجھے پہچانی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

تیل سے بے نیاز اس کی سوکھی زلفیں چہرے پر بھری ہوئیں اڑ رہی تھیں۔ اس ہی زح داؤد کو اس کے ہونٹوں کے کنارے سیاہ تل نظر آگیا۔ دیکھتے ہی ایک برجھی سی اس کے دل کے پار ہو گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اس پاس کوئی نہ تھا۔ ابو عطا چوکیدار کی آواز نزدیک تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا دل سینہ میں اس تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا گویا بس ابھی دم نکلنے کو ہے۔ کچھ کہے بغیر کانپتا ہوا وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ رنج و غم کی شدت سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس نے اپنی لائٹھی کو اٹھایا اور زخمی آواز میں دھیرے دھیرے بڑبڑاتے ہوئے خود ہی سے باتیں کرنے لگا۔ یہ زمیندہ تھی۔ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید ہوشنگ اس کا منگیتیر یا شوہر ہو، کون جانے؟

نہیں... نہیں... ہرگز بھی نہیں۔ زیادہ اس کی چھان بین کرنے
کی بجائے اس کی پردہ پوشی کرنا چاہئے۔ مگر... نہیں... نہیں...
اب میرے لئے مشکل ہے۔

وہ اپنے آپ کو کھینچتا ہوا اس کتے کے پاس لے چلا جس کو
سرِ راہ دیکھا تھا۔ کتے کے پہلو میں بیٹھ کر داؤد نے اس کے سر کو
اپنے ابھرے ہوئے سینے سے لگا کر محبت سے بھینچا۔ لیکن...
اب وہ کتا بھی مرچکا تھا۔

مہدی حمیدی

ڈاکٹر مہدی حمیدی ۱۹۱۴ء/۱۲۹۳ش، شیراز کے ایک عالم خاندان میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول سے لے کر ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری انہوں نے اپنی ہی مادر وطن کی درس گاہ سے حاصل کی۔

مہدی حمیدی شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ صاحب نگاہ مولف و مرتب بھی ہیں اور مترجم بھی۔ وہ اپنے وطن اس کی تہذیب اور اعلیٰ مشرقی قدروں سے پیار کرتے ہیں اور ان کے ایمن بھی ہیں۔ شاعری میں فن عروض اور قوافی و ردیف کی قدیم روایات کے پاسدار ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ رباعی اور اعلیٰ قصائد پر مبنی ہے۔

مہدی حمیدی کا انتخاب ”دریای گوہر“ (جلد ۳) کے عنوان سے ہندو ایران میں ایک خصوصی مقبولیت کا حامل ہے۔

ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی پائی جاتی ہے اور ان کو انشائیہ کا اچھا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حمیدی کی چند تصانیف درج ذیل ہیں:

فرشتگان زمین، شاعر در آسمان، سبکسری ہای قلم پس از یک سال، عشق در بدر، شگوفہ ہا سالہای سیاه، اشک معشوق، طلسم شکستہ اور زمزمہ بہشت وغیرہ۔

میری جنت^{۱۵}

شیراز کے جنوب میں دنیا کے ہنگاموں سے دور خوبصورت
 باغ سے آراستہ ایک پرسکون اور پُر فضا وادی پھیلی ہوئی ہے۔
 ہر سال جب وہاں بہار آتی ہے اور زندگی اپنی پوری شادابی
 کے ساتھ مسکراتی ہے تو کوہستانی پرندوں کی چہچہاہٹ اور
 چشموں کی گنگناہٹ کے سایہ میں پھول کھلتے اور مرجھا جاتے ہیں۔
 جب خزاں کی تند ہوائیں چلتی ہیں اور پتوں پر زردی
 بیٹھنا شروع ہو جاتی ہے تو موسم گرما کا آخری پھول بھی اپنی
 بہار دکھا کر رخت سفر باندھنے لگتا ہے۔

دل کو لبھانے والا جلت رنگ بجاتا چشمہ جس کا پانی سچے موتیوں

کی آب و تاب کی مانند صاف و شفاف اور پہاڑ کی برفیلی ہواؤں کی طرح سرد ہے۔ جنگل کے سینے کو چیرتا ہوا ایک نہر کی شکل میں دور دراز کی منزلیں سر کر کے گنگناتا ہوا نہ جانے کہاں سے آتا ہے اور کدھر چلا جاتا ہے۔

یہ خوبصورت نہر بہار کے زمانہ میں ایسی دل فریب اور دلکش ہو جاتی ہے کہ بیان سے باہر نہر کے کنارے کنارے تاحد نظر دورویہ گل لالہ اور جنگلی پھول لگے ہیں سبزے کے بیج اگے ہوئے خوشبودار پھول فضا کو مست و بخود بنا دیتے ہیں۔

بید مجنوں کا چھوٹا سا پیر اپنی خمیدہ کمر کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے نظر پڑتا ہے۔ اس کی سرسبز شاخیں چاروں طرف پھیلی یوں حلقہ باندھے نظر آتی ہیں جیسے کوئی چھاتہ لگائے کھڑا ہو۔ اس کی ٹہنیوں کا زیادہ تر حصہ دیوار پر پھیلا ہے اور کچھ دیوار سے باہر کی طرف لٹکا ہوا ہے۔ یہ آشفنگی شاید مدرسہ سے بھاگے بچوں کی خاطر ہے۔

وہ اس راہ سے گزریں تو دوشیزہ کی مانند اس کی کمر سے نیچے لٹکی زلفوں کے سہارے باغبان کی نظر بچا کر دیوار کی مدد سے اوپر چڑھ سکیں۔ اور اس خوف سے دور کہ مالی دیکھ رہا ہو گا پورے سکون کے ساتھ اس کی خوبصورتی کا مزہ لے سکیں۔

بید کا یہ منحنی سا پرانا اور بوڑھا درخت جو اندر کی طرف کھڑا

ہوا باہر کی سمت جھانک رہا ہے۔ شاید باغبان کی سالہا سال
 کوششوں کا ثمرہ ہے۔ بوڑھے باغبان نے اس درخت کی اس
 پشیمینہ پوش قلندر کی مانند حفاظت کی ہے جس کے پھل اگرچہ
 لعل و گہر کی مانند قیمتی نہیں ہوتے مگر پھر بھی ان کی اپنی ایک
 اہمیت اور حیثیت ہوتی ہے۔ یہ درخت دور سے اس بوڑھے مالی
 کی طرح نظر آتا ہے جو دیوار سے ٹیک لگائے باغ کی حفاظت کی
 خاطر باہر کی طرف تاک رہا ہو۔ میں نے اس کے لمبے اور گھنیرے گیسوؤں
 کی چھانوں میں بیٹھ کر آنسو بہائے ہیں اور اپنے غم کو ہلکا کیا ہے۔
 سحرانگیز نغمے بکھیرتی نہر اس کے پتوں کا منہ دھلاتی ہوئی گزرجاتی
 ہے۔ یہ درخت اپنے گدے دار تنہ کے ساتھ نہر کے کنارے اس طرح
 جھکا ہوا کھڑا ہے کہ بچے آسانی کے ساتھ سیر بھی کی مانند اس گدے
 پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ اور وہاں بیٹھ کر پانی کے اندر اس
 کی تھرتھرتی شاخوں اور پتیوں کے عکس کے نیچے مچھلیوں کے دلکش رقص
 کا نظارہ کرتے ہیں۔

میں نے خود بارہا ایسا کیا ہے اور اس نظر فریب سحر آمیز منظر کا
 لطف اٹھایا ہے۔ میری جگہ اگر آپ بھی ہوتے تو ایسا ہی کرتے۔
 بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میں اپنے عزیز ترین غم گار
 دوستوں کے ہمراہ سیر و تفریح کی غرض سے وہاں گیا ہوں اور اس
 کی شاخوں کے سایہ میں نہر کے کنارے بیٹھ کر اس کی کھلتی لہروں

میں ماضی اور مستقبل کی بنی بگڑتی تصویروں کو دیکھا ہے۔ ساتھ ہی وہاں اپنے دوست سے ساز پر روح پرور مدہوش کر دینے والی دھنیں سنی ہیں۔ چابکدستی سے تاروں کے ساتھ کھیلتی ہوئی انگلیوں کے فن کا نمونہ دیکھا ہے۔ اور اس سے ابلتا وہ پر شور نغمہ جو آسمان کی سرحدوں کو چھوتا ہے اس کا لطف اٹھایا ہے۔ ساز کی لے پر گنگنائے اس شعر کی حقیقت کو بھی سمجھا ہے کہ:

بسیار سالہا بسر خاک — مارود
کاین آب چشمہ آید و باد صبارود
(یعنی صدیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں یہ چشمہ اس
ہی انداز میں بہہ رہا ہے اور باد نسیم کے جھونکے یوں ہی چلتے رہتے
ہیں)

اب کہاں تک اس کی تفصیل بیان کروں یوں سمجھئے ساز کا
سحر اس وقت لوط طاجب نغمہ اپنے اختتام کو پہنچ کر دم توڑ دیتا اور
میرا دوست ساز کو ایک طرف رکھ کر سیکار سلگا لیتا تب یہ حقیقت ٹھہ
پر واضح ہوتی کہ میری آنکھوں سے بہتے آنسو شبنم کے قطروں کی مانند
نہر میں گر رہے ہیں۔ یہ صاف و شفاف آنسوؤں کے ڈھلکتے سرے
جو ابھی نہر میں گر رہے ہیں کچھ عرصہ نہ گزرے گا کہ سمندر میں جا کر
مل جائیں گے شاید میری زندگی بھی اس ہی ننھے سے قطرے کے
مانند ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دن اپنی اصل

سے جانے گی۔ اگر ایسا ہو تو کتنا اچھا ہو۔ اور یہ میری کون سی نیکی کا انعام ہوگا؟

جب موسم سرما اپنے اختتام کو پہنچتا ہے اور گلابی سردی کے جان پرور باد نسیم کے جھونکے بادام کے شگوفوں کو کھلا دیتے ہیں اور پرندے اپنے سفر سے واپس لوٹتے ہیں اور دنیا میں خوشی و مسرت کی ہنگامی کیفیت برپا ہو جاتی ہے تو ایسے ماحول میں بید مجنوں کے اس ہی منحنی پیڑ کی چھاؤں میں اس ہی نہر کے کنارے اور میرے ان بہترین دوستوں کی پر مسرت محفلیں سمجھتی جن کے دل محبت سے معمور اور اسنگوں و آرزؤں سے بھرپور ہوتے تھے۔ اس ہی ماحول اور پرفضا مقام پر کھیلتے کھیلتے ہم نے بچپن سے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ دیئے۔

کیا اچھا زمانہ تھا اور کس تیزی کے ساتھ گزر گیا۔ اور ابھی تک جب بھی میرا دل زمانہ کے رنج و غم سے اوب جاتا ہے اور مشکلات دامن گیر ہو جاتی ہیں، تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس ہی طرف بھاگ چلوں اور وہاں کے پرسکون ماحول میں خاموشی کے ساتھ آنسو بہا کر غم کی گرد کو چہرے سے دھو ڈالوں۔ حقیقتاً اس مقام پر پہنچ کر مجھے لگتا ہے کہ اس باغ کے در و دیوار، بید مجنوں کی ہاتھ پھیلائے شاخیں لہلہاتا ہوا سبزہ سب میرے پرانے اور غمگسار دوست ہوں۔ سب مجھ سے میرا غم معلوم کرتے اور دلدہی کرتے دکھائی پڑتے ہیں۔